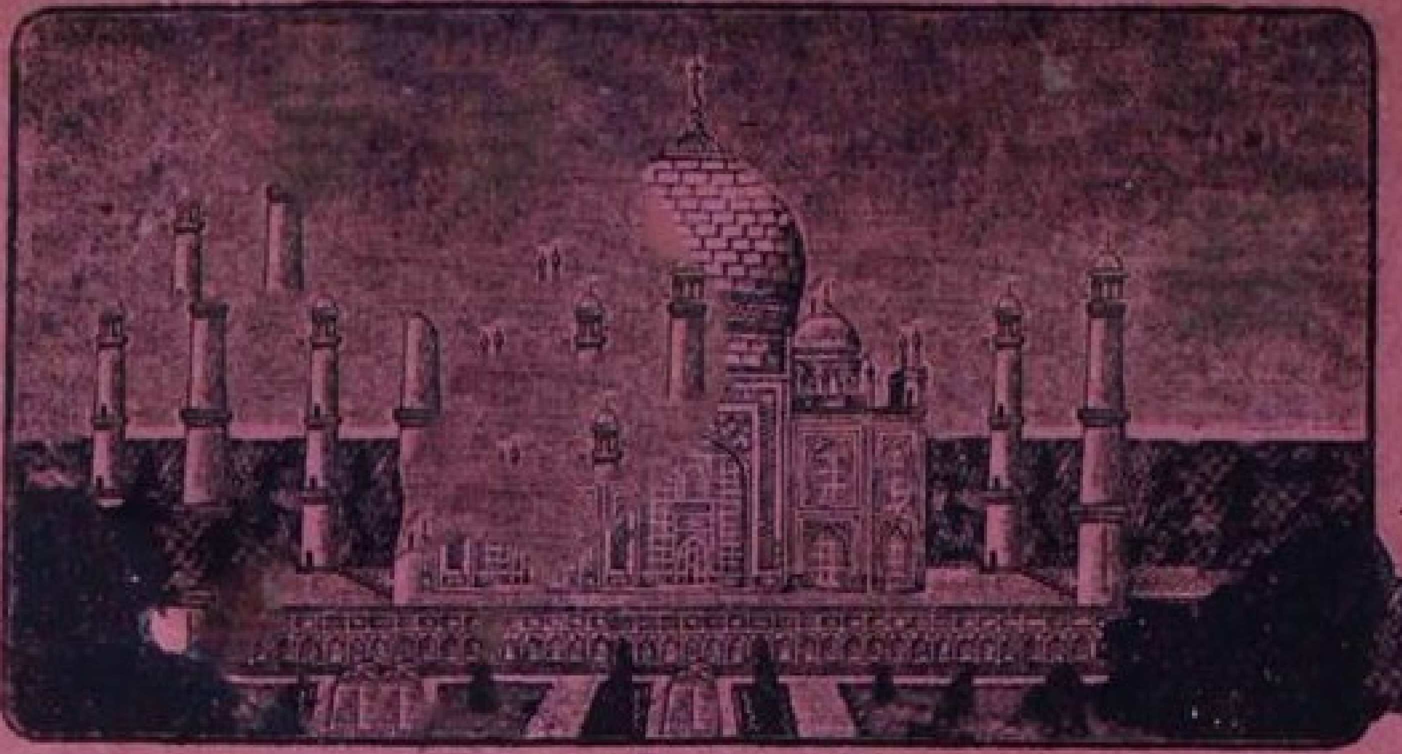

نگار

مجلۂ علمیہ و ادبیہ

رئیس التحریر

نیاز فتحپوری

۷۸۶

نگار

رئیس التحریر [illegible]

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۱۰۴
جلد ۲
شمارہ ۶

دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء

قیمت سالانہ ۵ر ششماہی ۳ر
قیمت فی پرچہ ۸/ - دسمبر نمبر ۱ر

فہرست مضامین

ملاحظات ...... اڈیٹر ۲
استقلال قومی ...... اڈیٹر ۳
غزل (فارسی) ...... اڈیٹر ۹
اقوال مشاہیر یورپ ...... [illegible] ۹
ملاءِ اعلیٰ کا سیاح (افسانہ) لطیف الدین احمد ۱۰
حرکت کے کرشمے ...... اڈیٹر ۲۵
افکار وحشت (غزل) سید رضا علی وحشت ۳۵
بیاض نیاز ...... اڈیٹر ۳۵
جاپانی شاعری ...... سید حسن عابد جعفری بیرسٹر ۳۶
اباب شکستہ کا نغمہ (نظم) سید محمد محمود رضوی بی اے مخمور اکبرآبادی ۴۵
مادیین کا مذہب (۳) ...... اڈیٹر ۴۶
شادی (اقوال) ...... اڈیٹر ۵۲
نپولین و جوزفائن - (افسانہ) حافظ امام الدین اکبرآبادی ۵۳
زردانہ (نظم) ...... امین حزین ۶۲
گل نرگس ...... نذیر احمد قریشی ۶۳
ناسزا جوانی - (نظم) شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی ۷۱

ستی (افسانہ) [illegible]
اسلام میں سلطنت [illegible]
ہوا کے کرشمے ...... اڈیٹر ۸۹
غزل ...... اڈیٹر ۹۴
کلام آسی ...... عارف ہسوی ۹۵
غزل ...... ابوالفاضل سید راز چاندپوری ۱۰۷
ولادت و ہجرت نبوی کی صحیح تاریخ ...... اڈیٹر ۱۰۸
نوائے راز (غزل) ابوالنعیم نشتر جالندھری ۱۱۸
میر کا دل ...... "قمر" ۱۱۹
کلام فانی (غزل) شوکت علیخاں فانی بی اے ایل ایل بی ۱۲۵
مشہد عروس ...... محمد الدین خلیقی دہلوی ۱۲۶
کلام شاد ...... حضرت شاد عظیم آبادی ۱۳۷
نور کی پتلی ...... ابوالفاضل سید راز چاندپوری ۱۳۸
استفسار و جواب ...... اڈیٹر ۱۳۹
اولین تنفس بہار ...... لطیف الدین احمد ۱۴۵
انتقاد ...... اڈیٹر ۱۴۰-۱۵۲

ملاحظات

۱- ایک وقت تھا جب اجراء "نگار" [illegible] پال صرف دماغوں کو آباد کئے ہوئے تھا، آج وہ دن ہے جب اسکی زندگی کا پورا ایکسال گذر چکا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اپنے یکسالہ تجربات کی بنا پر جن میں خدا جانے کسقدر نقوشِ تحسین اور کتنے داغہائے طعن و ملامت شامل ہیں، اپنی تعین متحو [illegible] دار نکوہش، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نگار نے جس آغوش میں اپنے عہد مہد کا پہلا سال اسف [illegible] بسر کر دیا، وہ آغوش سرزمین تاج کے صرف ایک متنفس کی تھی جسے ناظرین نگار صاحب لالہ رُخ کی [illegible] ور میں اُسے خلوت و جلوت، خواب و بیداری میں صرف لطیف کے نام سے یاد کرتا ہوں۔ وہ لطیف کہ جب [illegible] ں نے اسکو اچھی طرح نہیں جانا تھا، میں اس لفظ کے صحیح و وسیع مفہوم سے بھی نا آشنا تھا۔ نگار، لطیف ہی کی تحریک سے عالم وجود میں آیا۔ اور انھیں کی کوشش و کاوش سے اسوقت تک جاری ہے۔ دوسرا شخص صرف اسقدر سمجھ سکتا ہے کہ نگار کا ادبی حصہ جس نے بلا استثنا ہر شخص کی داد حاصل کی محض لطیف کے قلم سے پورا ہوتا رہا، لیکن مجھے [illegible] ار نگار، انھیں کی کوشش کا ممنون ہے اور صرف ایک انھیں کے وجود نے نگار کو منیجر، پبلشر، محاسب و محرر۔ مدیر و معاون مدیر [illegible] کے ساتھ (اگر عالم اسباب میں محض دعا یا تمنا کوئی کارآمد چیز نہیں ہے) یہ تلخ حقیقت بھی فراموش نہیں کیجا سکتی کہ بزم نگار نے اور تمام افراد نے (الا ماشاء اللہ) اپنی فرض شناسی کا مطلق کوئی ثبوت نہیں دیا اور انکی یہ کم نگاہیاں" شاعرانہ زبان میں "یاد رکھنے" کے قابل ہیں۔

۲- مجھے افسوس ہے کہ دیگر اہم مضامین و مباحث کی وجہ سے معلومات کا حصہ اس نمبر میں نہ دیا جا سکا، وہ لوگ جو اس حصہ کو زیادہ دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں اُن سے معذرت خواہ ہوں اور جنوری میں اسکی تلافی کا وعدہ کرتا ہوں۔

۳- حصہ نظم میں جناب مخمور اکبر آبادی کے جذبات جو انھوں نے "ربابِ شکستہ کا نغمہ" کے عنوان سے ظاہر کئے ہیں خصوص طور پر قابل داد ہیں۔

۴- "اسلام میں سلطنت کا مفہوم" مسٹر خدا بخش کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔ سید وزارت علی صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مسٹر موصوف کے تمام اہم مضامین کا ترجمہ نگار کو دینگے۔ شکریہ۔

۵- جنوری سے لطیف کا ملکوتی رومان شروع ہوگا جو مور کی ایک نہایت ہی بے مثل مثنوی سے ماخوذ ہے۔

۶- نومبر سے بعض اصطلاحات فقہ و تصوف کا اردو ترجمہ بجواب استفسار شروع کیا گیا ہے۔ میں ممنون ہونگا اگر کوئی صاحب اس بات میں مجھے زیادہ صحیح مشورہ دینگے۔ (اڈیٹر)

اعلان ضروری

چونکہ دسمبر نمبر دوچند ضخامت کا ہے اس لئے جو حضرات فروری سے ایکسال کے لئے اور اگست سے ۶ ماہ کیلئے خریدار ہوئے تھے، انکا چندہ اس اشاعت کیساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ براہ کرم دسمبر نمبر موصول ہوتے ہی آیندہ سال کا چندہ منی آرڈر کے ذریعہ سے روانہ فرما دیجئے ورنہ بہ حالت سکوت ہم مجاز ہونگے کہ جنوری کا نگار وی پی کے ذریعہ سے بھیجیں، جسمیں آپ کا نقصان ہے۔ (مینیجر)

باسمہ

نگار

مجلد ۲ شمار ۶	دسمبر ۱۹۲۲ء	قیمت سالانہ پیشگی صہ، قیمت ایک پرچہ آٹھ آنہ دسمبر نمبر

استقلال قومی

اس وقت دنیا ایک سیاسی بحران میں مبتلا ہے اور کوئی شخص اسکے انجام پر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ دنیا میں ہر فعل کے ساتھ رد عمل، ہر اوج کے ساتھ حضیض اور ہر ہاں کے ساتھ اک نہیں موجود ہے لیکن اس دوئی Dualism کا عجیب و غریب منظر اسوقت رونما ہوتا ہے جب جذبات پنہاں جوارح و حرکات میں، اور انفرادی اغراض اجتماعی مقاصد میں تبدیل ہو جائیں۔

عالم میں تمدن نے (اگر حقیقتاً تمدن کا مفہوم موجودہ ترقی کو دیکھکر سمجھا سکتا ہے) جس انداز سے ترقی کی ہے اس کی داستان حد درجہ درد انگیز اور اس لیئے بے انتہا عبرت خیز ہے۔ کونسی بیدردی ہے جو مداوائے درد کیلئے استعمال نہیں کی گئی اور وہ کونسا ظلم ہے جو حصول امن کے لئے روا نہیں رکھا گیا لیکن آج کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بیدردی اک برکت نہ تھی اور یہ ظلم واقعی ظلم تھا۔

اگر کوئی کہے کہ عہد حاضر میں دنیا کی گذشتہ کوششوں کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ ہمیں کوئی علامت ایسی نہیں ملتی جس سے معلوم ہو سکے کہ واقعی نظام عالم امن و سکون سے قریب تر ہوتا جاتا ہے تو یہ اسی قدر غلط ہے جتنا کسی کا مدعی ہونا کہ دور استبداد کے لئے حکمران افراد کو نیست و نابود کر دینا سخت ظلم تھا۔ نہ اُس وقت ظلم کیا گیا نہ اب کوئی مایوسی ہے۔ کیونکہ جسطرح پہلے اک مختصر پیمانہ پر ظلم روا رکھ کر دنیا کو اس حد تک لایا گیا

ہے اسی طرح اگر قانون فطرت کسی اور تازہ اصول کو رواج دینا چاہے گا تو پہلے سے زیادہ ظلم کیا جائیگا خواہ قدرت کو کرۂ ارض کی آبادی کی [illegible] کیوں نہ کرنا پڑے۔

تاریخ عالم کا یہ بار بار دُ[illegible]ام عالم کی ترقی اک لہر کیطرح ہوتی ہے اور اس کا مقابلہ کرنا گویا اپنے کو گرداب فنا میں ڈ[illegible] دیکھنا کہ قوم کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے اندر جذبات ترقی کیونکر پیدا ہوتے ہیں اور ان سے [illegible] سیاسیات کن اصول کو مرتب کرتا ہے، اس عہد روشن کا بہترین کارنامہ ہوسکتا ہے اگر ان سے کوئی گری ہوئی قوم اپنی شاہراہ عمل قائم کرسکے یا کوئی ملک اپنی سیاسی یا اقتصادی اضطراب کو دور کرسکے۔

قوم کا مفہوم اس سے ہر شخص آگاہ ہے کہ قوم مجموعہ ہے افراد کا لیکن سیاسی لحاظ سے ایسے افراد قوم نہیں بنا سکتے جو نسل، زبان، عقائد سیاسی مصالح اقتصادی و تقسیم جغرافی کے لحاظ سے [illegible] جب افراد ان روابط سے متحد ہوکر اجتماعی ہستی پیدا کرلیتے ہیں تو پھر اس وقت جماعت کو حرکت دینا افراد کو متحرک بنانا ہے اور افراد کا متاثر ہونا ساری قوم کا متاثر ہونا ہے کیونکہ قوم حقیقت میں افراد کی وحدت اعمال وحرکات کی وحدت اور غایت کی وحدت کا دوسرا نام ہے اگر ان روابط میں ضعف پیدا ہوگا تو قوم بھی من حیث القوم ضعیف ہوجائے گی اور وہ شیرازہ جسنے تمام افراد کو یکجا کردیا تھا منتشر ہوکر اسے مختلف جماعتوں میں تقسیم کردیگا جن کے اغراض ایک دوسرے کے مخالف اور جن کے مقاصد باہم دگر متضاد ہونگے پھر تاریخ اٹھاکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس تفریق کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ ان جماعتوں میں باہم جنگ ہوکر ملک کی حالت سقیم ہوگئی یا کسی دوسری قوم نے ان کو آکر اپنا محکوم بنالیا۔

وہ تمام روابط قومی جن کا ذکر ابھی کیا گیا مختلف درجے رکھتے ہیں اور مختلف قوموں میں انکا معیار مختلف ہے۔ مثلاً مشرق میں بہ نسبت مغرب کے عقائد مذہبی زیادہ قوی ہیں۔ یہانتک کہ ایک ہی وطن اور ایک ہی نسل میں مختلف جماعتیں بن گئی ہیں۔ اس لئے یہاں اگر کوئی ما بہ الاشتراک رابطہ پایا جاسکتا ہے تو وہ صرف سیاست ہے۔ برخلاف اس کے مغرب میں صرف سیاسی عقائد ربط واتحاد کی وجہ قرار پاتے ہیں اور مذہب کو وہاں کوئی دخل نہیں ہے اسیطرح ممالک متحدہ امریکہ میں رابطۂ مذہب تقریباً معدوم ہے اور جنوبی امریکہ میں نسلی رابطہ بہ نسبت نیوزیلینڈ کے زیادہ مستحکم سمجھا جاتا ہے۔

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ مستحکم ترین رابطہ آجکل صرف زبان ہے اور قوموں کی

تکوین وانحلال ان کے بننے بگڑنے میں اس رابطہ کو بہت بڑا دخل ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ جب کسی ملک یا قوم کی زبان ایک ہوگی تو اس کے افراد خیالا[illegible] بہت جلد اور زیادہ آسانی کے ساتھ متحد ہوسکیں گے۔ چنانچہ حال کی جنگ عظیم میں [illegible]نی کو تمام دیگر روابط پر ترجیح دیکر اپنی پالیسی متعین کی وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔

زبان کے بعد ملکی یا جغرافی رابطہ کا مرتبہ ہے کیونکہ خطے [illegible]ے متحد ہونے سے اتحاد پیدا ہوتا ہے اسیطرح اتحاد ملک سے قوم کا وجود ظہور میں آتا ہے۔ رابطۂ ملکی کے بعد رابطۂ نسل عقائد عادات و رسوم اور مصالح اقتصاد وغیرہ ہیں۔

ان روابط کو ذہن نشین کر لینے کے بعد ایک شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ فرانس اور ممالک متحدہ امریکہ کی قومیت انگریزی قومیت سے کیوں زیادہ مستحکم ہے اور انگریزی قومیت کے مقابلہ میں آسٹریا کے مقابلہ میں ٹرکی کی قومیت اور ٹرکی کے مقابلہ میں ہندوستان کی قومیت کیوں ضعی[illegible]

تربیت اجتماعی جس قوم پر کوئی ایک فرد یا کوئی مخصوص جماعت مستبدانہ طریق پر حکومت [illegible] کے باہمی روابط اتحاد ضعیف ہوجاتے ہیں یا بالکل مفقود۔ اور حاکم و محکوم راعی و رعایا کے درمیان رفتہ رفتہ ایسی غیریت پیدا ہو جاتی ہے کہ آخر کار طلسم استبداد ٹوٹ جاتا ہے اور سارے ملک میں انقلابی لہر دوڑ کر اشتراکیت فوضیت و عدمیت (نہلزم) کے جذبات ترقی پذیر ہو جاتے ہیں۔

اس کی مثال میں علاوہ انقلاب فرانس کے روس کا موجودہ انقلاب پیش کیا جاسکتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیام حکومت کے لئے جذبات عوام کا لحاظ کسقدر ضروری ہے انقلاب سے قبل روس کی یہ حالت تھی کہ وہاں کی آبادی دو طبقوں پر منقسم تھی۔ ایک جماعت امرار دوسری جماعت عوام (متوسط جماعت وہاں بالکل معدوم تھی جو امرار و عوام کے درمیان عقدۃ الوسطےٰ کی حیثیت رکھتی ہے) لیکن ان دونوں کی اجنبیت کا یہ عالم تھا کہ ایک دوسرے کی زبان بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اور امرار غربا کے ساتھ بالکل وہی سلوک کرتے تھے جو ایک جانور کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ نہ انھیں ملازمت ملتی تھی نہ حکومت میں انکا کوئی حصہ تھا۔ نہ وہ عمدہ کپڑے پہن سکتے تھے نہ ان کے لئے شفا خانے تھے اور نہ تعلیم کے لئے مدارس۔ عین اس وقت جبکہ امرار اپنے سر بفلک ایوانات میں مخملی گدوں پر محو خواب یا مصروف عیش ونشاط رہا کرتے تھے۔ غربا جھونپڑوں میں میدانوں میں حد درجہ افلاس و عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ امرار نے اپنے لئے جرمنی میں مخصوص طور سے شفا خانے

طیار کرائے تھے تاکہ وہ فرانس میں اپنی لہو ولعب کی زندگی سے فارغ ہونیکے بعد یہاں آئیں اور اپنی کھوئی ہوئی قوت وصحت کے اعادہ کی ... درانحالیکہ غریبوں کے لئے سارے ملک میں ایک اسپتال بھی موجود نہ تھا۔ غربار کے ... گئے تھے اور وہاں اُن کو جان فرسا محنت کے بعد نصرف قلیل غذا ملتی تھی بلکہ ایسی چیزیں کھانے ... نہیں مشکل سے غذا کہا جا سکتا ہے۔

ایک بار کوئی کاشتکار سینما (تصاویر متحرکہ) کی مشین اپنے گاؤں لے گیا تاکہ گاؤں کے لوگوں کو یہ عجیب وغریب تماشے دکھائے لیکن جب حکومت کو خبر ہوئی تو اُسنے یہ مشین ضبط کرلی۔ اور اُسے سائبیریا کیطرف جلاوطن کردیا کیونکہ وہ قانوناً ایسے اسباب تفریح وتعیش استعمال نہ کرسکتا تھا۔

کسی امیر کے پاس ایک جوان خادمہ تھی جسکا محبوب (جو فوج میں ملازم تھا) مرگیا۔ اس صدمہ سے یہ رونے لگی تو ... کی آنکھیں فرط حسرت سے پھٹ گئیں کیونکہ اس کے نزدیک غریبوں میں محبت کا مادہ ہی فطرت ... چھین لیا ہے۔

الغرض یہ تھی وہ بیگانگی حکمران جماعت اور طبقۂ غربائ کے درمیان جس نے آخر کار روس میں انقلاب برپا کردیا اور ابتک وہاں کے مصائب ختم نہیں ہوئے۔ چونکہ تاریخ ہمیشہ اس نوع کی مثالیں محدود یا وسیع پیمانہ پر ہمارے سامنے پیش کرتی رہتی ہے اسلیئے علم سیاست میں تربیت اجتماعی کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی ہے جسکے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی

تربیت اجتماعی سے یہ مراد ہے کہ قوم اپنے حقوق کا احساس کرے اور اشتراک عمل کے اصول پر کام کرکے نفع ونقصان کا اثر اجتماعی حیثیت سے قبول کرے اسی لئے حقوق اجتماعی کا انحصار تین اصولی باتوں پر ہے۔

(۱) قوم کے افراد کو قانون نافذ پر تنقید کرنے کا پورا اختیار حاصل ہو اور وہ ہر اُس قانون کے وضع کرنے کے مجاز ہوں جسے وہ اپنے لئے بہتر سمجھتے ہیں۔

(۲) نظام حکومت قائم رکھنے کے لئے وہ اپنی مرضی کے مطابق وزرار وحکام منتخب کرسکیں۔ اور

(۳) ہر شخص کو قانون سے فائدہ اُٹھانے کا مساوی حق حاصل ہو۔ ان تینوں اصولی باتوں کے حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لئے بھی تین باتیں ضروری ہیں۔

(۱) قوم کے تمام افراد اور مختلف طبقات اس قانون کا احترام کریں جسے جمہور نے وضع کیا ہے اور مساوی طور پر اسکے نفاذ وقبول میں حصہ لیں۔ کیونکہ جماعت کے خیالات کا اختلاف سیاسی انتشار پیدا کرتا ہے اور سیاسی ضعف قومی استقلال کا سخت دشمن ہے۔

۲- چونکہ اکثر امور میں تمام افراد کا اتفاق دشوار ہوجاتا ہے اس لئے اختلاف کیصورت میں اکثریت معتبر سمجھی جاتی ہے اسحالت میں اُن افراد کا جن کی رائے کے خلاف فیصلہ ہوا ہے فرض ہونا چاہیے۔ کہ وہ فریق غالب کا فیصلہ خوشی سے قبول کرلیں۔ کیونکہ امور اجتماعیہ میں خطا و صواب [illegible] کثرت رائے ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں کثرت رائے غلطی کیطرف مائل ہو۔ تاہم [illegible] لئے یہی ضروری ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے۔ کیونکہ اکثریت کی غلطی سے جو خرابی [illegible] عیبت سے بدرجہا کم ہو جو اقلیت کے اصابت رائے سے پیدا ہوتی ہے۔ اگروہ اکثریت [illegible]

ہندوستان میں اکسٹریمسٹ اور ماڈریٹ طبقے اسکی بہترین مثالیں ہیں۔ یقیناً اعتدال پسند جماعت بھی ملک کی بہی خواہ ہے لیکن چونکہ اسکے افراد قلیل ہیں اور اکثریت انتہا پسندوں کو حاصل ہے اسلیئے ضروری ہے کہ ماڈریٹ بھی اس فیصلہ کے ہم آہنگ ہوجائیں ورنہ کبھی کامیابی نہیں ہوسکتی۔

۳- مصلحت عامہ کو مصلحت انفرادی یا شخصی پر مقدم سمجھنا چاہیئے۔ بعض صورتیں [illegible] ایک یا چند مخصوص افراد کی مرضی کے خلاف فیصلہ کیا جاتا ہے اور اسکا اسمیں نقصان [illegible] ہمارا فرض ہے کہ عام جماعت کی اس حکم کی تعمیل خوشی سے کریں۔ مثلاً حاکم بلدیہ کسی مکان کے منہدم [illegible] مریض کو شہر سے علیحدہ کرنے کا حکم دیتا ہے جو مالک مکان اور اُس مریض کے لئے حد درجہ تکلیف دہ ہے لیکن اسے سمجھنا چاہیے کہ صرف مصالح کی بنا پر اسکو یہ آزار پہونچایا جاتا ہے جس سے ساری جماعت کا فائدہ وابستہ ہے اور قربانی کا یہ جذبہ ہم سب میں پیدا ہونا چاہیے کہ جماعت یا قوم کے فائدہ کے لئے اپنے ذاتی اغراض کو ترک کردیں۔ یہی ہے تعامل و تعاون جسپر حیات اجتماعی کا انحصار ہے اور اسی کی مخالفت ہے اتحاد قومی کا انحلال اور نظام جماعت کا فقدان جس کے نقصانات کسی سے مخفی نہیں۔

ارتقاے تمدن

آجکل جمہوریت۔ دستوریت۔ حریت و آزادی کا خیال اسقدر سرعت کے ساتھ ترقی پذیر ہے کہ بعض عوام اصولی غلطی میں مبتلا نظر آنے لگی ہیں۔ حالانکہ استقلال قومی اُن قبائل میں کبھی نہیں پایا جاسکتا جنھوں نے تمدن کو ابھی قبول نہیں کیا ہے۔ افریقیہ کی آزاد قبائل یاد بینا کے اور خود مختار جماعتیں جو بظاہر آزاد نظر آتی ہیں حقیقتاً آزاد نہیں ہیں۔ ان کی آزادی صرف افراد کی سی آزادی ہے۔ وحشی قبائل میں اُسوقت تک قومیت پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اُنمیں کسی ایک ذی فہم شخص کو اقتدار نہ حاصل ہوجائے اور پھر اسطرح وہ رفتہ رفتہ تمدن کے تمام مدارج طے کرکے اس نقطہ پر نہ پہونچ جائیں جب استبدادی

اقتدار از خود فنا ہو جاتا ہے اور استقلال قومی اسکی جگہ لیکر ہیئت اجتماعی پیدا کر دیتا ہے پھر اسکے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قوم کے تمام افراد میں رنگ تمدن پیدا کیا جائے اور ایک نسبت سے وہ علوم فنون میں ترقی حاصل کریں ورنہ قوم دو طبقوں میں تقسیم [illegible] گی - اور تعلیم یافتہ طبقہ دوسرے طبقہ پر حکومت کرنے لگے گا جیسا کہ آج ہندوستان میں دیکھ [illegible] س میں حکومت بالشیوک نے اس تفریق کو مٹانے کی کوشش کی ہے اور اُسنے ایک جاہ [illegible] ا و نادان کو دوشس بدوش کھڑا کرنے کی سعی کی ہے - لیکن اسکی کامیابی بالکل محال ہے کیونکہ افراد میں مساوات کی حس پیدا کرنا یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ اپنے جسم کو ایک دوسرے کے ساتھ آزادی کے ساتھ مس کر سکیں بلکہ وہ مساوات ذات و روح سے متعلق ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب قوم کے تمام افراد ساری جماعتیں ایک نسبت سے علم و تمدن میں ترقی کریں -

ہیئت اجتماعی کی حقیقی روح استقلال ذاتی صرف اُسیوقت حاصل ہو سکتا ہے جب وحدت قومی پیدا کر دیجائے اور وحدت قومی کی صرف صورت یہ ہے کہ تمام افراد کے خیالات و تصورات، افکار و عواطف ایک قالب میں ڈھل جائیں - ہندوستان کو دیکھئے کہ یہاں اس لحاظ سے کسقدر اختلاف ہے کہ ایک جماعت عورتوں کے پردہ کو اُن کے حق میں ظلم سمجھتی ہے - دوسری جماعت بے حجابی اُن کے لئے سم قاتل تصور کرتی ہے - ایک گروہ یورپین لباس اختیار کرنے کے لئے مضطرب نظر آتا ہے دوسرا طبقہ قدیم لباس پر قائم رہنا ضروری سمجھتا ہے - بعض لوگ مغربی علوم و فنون کا حاصل کرنا قوم کے لئے نہایت ضروری خیال کرتے ہیں اور بعض حضرات قدیم علوم کے حدود سے باہر نکلنا کفر سمجھتے ہیں - پھر ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کیونکر وہ اتحاد خیال پیدا ہو سکتا ہے جو ہیئت اجتماعی کی روح ہے -

ایسے مختلف عناصر رکھنے والے ملک کا علاج یہی ہے کہ ساری قوم کا طریق تعلیم و تربیت ایک کر دیا جائے اسکا فائدہ ہر چند موجودہ نسل نہ اُٹھا سکے گی لیکن دو نسلوں کے بعد وہ زمانہ آئیگا جب تمام مختلف طبقے اور متضاد عناصر متحد الخیال ہو جائینگے اور اپنے سیاسی، اجتماعی، علمی، اور اقتصادی مسائل پر یک جسم ہو کر کوشش کرینگے -

---

رومان

بعض لوگوں کی حیات معاشقہ ایک سلسلۂ طویل، ہے متعدد ابواب میں منقسم، بعض کی زندگی محبت ایک داستان مسلسل ہے متعدد مختصر افسانوں پر مشتمل کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی یہ حیات، یہ زندگی صرف ایک خواب ہے ابتدا و انتہا سے معرّا -

ل - احمد

غزل

نگرم بہ ہر رگِ سنگ رہ، ہمہ رنگِ صنعتِ آذری
کہ نہاد ایں قدر آگہی، بہ [illegible]ِ شیوۂ کافری

دلم امتیاز گرفت یا نگہِ تو یافتہ برتری
بہ فروغِ رسمِ فسوں گری، بہ قبولِ نقشِ ستمگری

نہ بہ نبضِ آئینہ می تپد، نہ بہ ریشۂ جگرم خلد
نگہے فگن کہ ترا سزد، بہ طرازِ عشوۂ دلبری

بہ رخت نقاب فگندہ، تہِ خیالِ دھر تپیدہ
ہمہ جا تو کفر فشاندہ، بہ فشارِ کعبۂ بت گری

تو بناز بردمِ خنجرت، من ازیں خیال بنازشے
کہ رساندہ ام بخط گلو، سرِ نشقِ برق تشادری

زفسردگیِ تا زُت، چہ بروئے یخ نہی داغِ دل
ہمہ التہاب غضب بشو، بہ سکونِ خوئے سمندری

بحصولِ جلوۂ دولتے، چہ کشی نیازِ مرا، کہ من
بہ جہاں نیافتہ آنسے، چو غنائے دولتِ بے زری

مشاہیر یورپ کے اقوال

(۱) حسین چہرہ ایک خاموش سفارش ہے - - - - - - لارڈ بیکن
(۲) اختصار ظرافت کی جان ہے - - - - - - - شیکسپیئر
(۳) علم کے جھوٹے دعوے سے جہل کا اعتراف بہتر ہے - - - - - شیکسپیئر
(۴) مستقبل کا بہترین پیشین گو ماضی ہے - - - - - - بائرن
(۵) حسین شے دائمی مسرت ہے - - - - - - - کیٹس
(۶) بدبختی انسان کو برے لوگوں سے روشناس کرا دیتی ہے - - شیکسپیئر

ما[illegible] عملی کا سیّاح

باب اوّل

(۱)

رعد یکسر واویلا بن گیا تھا، ہوائیں تمام تر فریاد ہو گئی تھیں، بارش پانی کی اک وسیع چادر بنی ہوئی تھی [illegible]، ایک شدید و کثیف تاریکی میں مبتلا تھی، ایک شعلۂ نیلمیں جو کبھی کبھی شاخدار بھی ہو جاتا تھا، منظر کو اپنی فوری چمک سے روشن کر جاتا تھا۔ ایک سرسبز قطعۂ زمین میں شاداب جنگل تھا اور اس کی بلند سطح کے وسط میں قدیم یونانی وضع کا ایک معبد قائم تھا۔

"جود[1] ہی میرا تنہا دوست ہے" ایک خانماں خراب مسافر نے جو اس معبد کی محراب میں پناہ گزین تھا کہا۔ "اگر آج کی رات اس کی قربانگاہ کی محراب نہ ہوتی، تو میری محبت کرنے والی بیوی اور فرمانبردار رعایا کا چاہا ہو کر رہتا۔"

طوفان رفع ہو گیا، ہوائیں سکوت کی گہرائیوں میں ڈوب گئیں، بارش ختم ہو گئی اور منتشر بادلوں کی نقاب سے نوخیز چاند نے اپنا چہرہ دکھلا کر فضا میں ایک خاموش نغمہ پیدا کر دیا۔

"اے شخص تو کون ہے، جس کا جود کے سوا کوئی دوست نہیں؟"

"میں وہ ہوں جسے بنی نوعِ انسان، بالاتفاق کمبخت و مردود کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"

"کیا تو کوئی فیلسوف ہے؟"

"ہاں اگر فلسفہ عبارت ہے مصیبت کوشی سے؛ ورنہ یوں تو میں ایک وقت بادشاہ تھا لیکن اب ایک خانہ بدوش بے نوا ہوں۔"

---

[1] Jupiter جوپیٹر تمام دیوتاؤں کا سردار۔

"لوگ تجھے کیا کہہ کر پکارتے ہیں؟"

"ایکزیان، تھسلی والا ایکزیان"

"تھسلی والا ایکزیان! میں تو سمجھتا ہوں وہ ایک خو[illegible] میری معلومات تو یہ ہے کہ اس نے حال ہی میں شادی کی ہے"

"اے خداوند، تھسلی اور اولمپس[1] میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اہل کی آسودگی تو صرف دیوتاؤں کا حصہ ہے"

"ہوں! کیا ڈیا[2] میں جذبہ رشک زیادہ تھا، جو ایک عام بات ہے؛ یا اس نے تجھ سے بیوفائی کی جو اس سے بھی زیادہ عام ہے؛ یا اس میں یہ دونوں باتیں تھیں جو سب سے زیادہ عام ہے؟"

"ان میں سے کوئی بات نہیں ہے، اور نہ ہماری نزاع کسی بات پر ہوئی البتہ جہاں محبت بہت کم ہوتی یا بہت زیادہ، وہاں ایک تنکے کا ٹوٹنا بھی خانگی مصیبتوں کے لئے بڑا سبب ہو جاتا ہے، چونکہ میں ایک بے پروا تھا اس لئے اس کے بہی خواہوں نے مجھے درشت دخشن کہہ کر بدنام کیا۔ وہ سرد مہر تھی اور عام رائے اس کے موافق؛ اور اسی کے ساتھ مجھے اپنے اور اپنی بیوی کے معاملات میں لوگوں کا مداخلت کرنا گوارہ نہ تھا۔ ڈیا نے ہر بات میں رائے عامہ پر عمل کیا، اس وجہ سے لوگوں نے اس کے افعال کو صحیح باور کر لیا۔ بہر نوع زندگی ہر حال میں زندگی ہے، خواہ وہ ایک محل کی زندگی ہو یا ایک جھونپڑے کی مجھے خوشی ہے کہ تو نے یہ رعد و برق کا کھیل موقوف کر دیا"

"کچھ عجب بے حس حیوان ہے۔ کیا ڈیا نے تجھے چھوڑ دیا؟"

"نہیں میں ہی اُسے چھوڑ آیا ہوں"

"تو نہایت بُزدل آدمی ہے"

"اصل بات تو یہ نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک طویل قصہ ہے۔ میرا بال بال مقروض ہو گیا تھا"

"ہاں حقیقت تو اب ظاہر ہوئی! بے شک بے زری تمام پریشانیوں کا سبب ہوتی ہے۔ لیکن تم لوگ اس معاملہ میں کتنے خوش نصیب واقع ہوئے ہو، ہم آسمان والے اس سے محروم ہیں۔ میں نے بھی ایک مرتبہ

---

[1] Olympus اولمپس یونانی میں شفاف و چمکدار کو کہتے ہیں اور معتقدہ میں اس نام کا ایک پہاڑ ہے جو جپیٹر کے دربار کی جگہ

[2] Dia (ڈیا) ایکزیان کی بیوی۔

اپنے باپ کے مقابلہ میں سرکشی کی تھی کیونکہ وہ نہ تو مرتا تھا اور نہ مجھے کافی جیب خرچ دیتا تھا۔"

"لیکن کسی دولت مند لڑکی [illegible] ہی کرلینا تو ممکن تھا، جیسا خود میں نے کیا؟"

"ہاں، مگر مجھے ایسے موا[illegible]ے، اس زمانہ میں نسوانی سوسائٹی نہایت محدود تھی؛ میں نے جب اس کی جستجو کی تو پارسٹی کے [illegible] یک بھی امیر لڑکی نہ تھی اور وہ عمر سے اتری ہوتی تھی، اور نہ کوئی بیوہ بجز میری ضعیف دادی تیرا[۵۱] کے اسقدر دولتمند تھی۔"

لیکن یہ تو اور بھی بہتر تھا، عورت جس قدر زیادہ عمر کی ہو اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ خیر، میں نے ڈیا، دیونیس کی لڑکی سے ایک معقول رقم کی شرط پر شادی کرلی، لیکن اس مرد شریف نے اپنا معاہدہ پورا نہ کیا تاوقتیکہ مجھ سے میرا اصطبل یک قلم منسوخ نہ کرادیا۔ اس سے زیادہ نامعقولیت اور کیا ہوسکتی ہے؟ بہرحال میں نے اسوقت ضبط سے کام لیا، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ اس نسبت کے باعث بازار والوں نے مجھے قرض دینا پھر شروع کردیا تھا؛ چنانچہ ایک سال تک بے غل وغش زندگی بسر ہوتی رہی، لیکن آخرکار اُن لوگوں نے خبر پائی اور بے صبری کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے ڈیا کی منت کی کہ وہ کوئی صورت نکالے، مگر وہ ایک کافرہ لڑکی تھی اس نے ہمیشہ اپنے باپ ہی کی طرفداری کی؛ اگر وہ اپنے شوہر کی حقوق شناس ہوتی تو ڈیا ایک مکمل عورت ہوتی۔ آخرکار میں نے دیونیس کو لاریسا[۵۳] کی گھوڑ دوڑ کے لئے مدعو کیا تاکہ اُسے خوش اور رضامند کرسکوں، لیکن وہ ایک بے اصول بوڑھا تھا؛ اس نے وہی گھوڑا جس پر میں نے شرط لگائی تھی اور سمجھتا تھا کہ کثیر دولت حاصل کرسکوں گا، خرید کر دوڑ سے نکال لیا اور میری شرط میری تباہی ہوکر رہ گئی۔ اس وقت میں نے اپنے غصہ کو چھپایا اور اپنے باغ میں ایک بڑا گڑھا کھدوا کر اس میں بہت سی آگ دہکوادی؛ شام کے کھانے کے بعد میں اور میرا خسر چہل قدمی کررہے تھے اتفاقی امر کہ قابل دیونیس اس گڑھے میں بغیر کسی خارجی حیلہ کے گر گیا۔ ڈیا نے مجھے اپنے باپ کا قاتل ٹھہرایا اور اپنے حیات مجروح کی تسکین کے لئے رعایا سے میرے قتل کی التجا کی۔ کچھ شک نہیں کہ وہ بہ لحاظ بیٹی ہونے کے بہترین تھی۔ جمہور کی رائے کا مقابلہ ناممکن ہوجاتا ہے ایک ہی وقت میں اولوالعزم بیوی اور غضبناک انبوہ سے کیونکر مقابل ہوا جاتا۔ بلوائیوں نے میرے محل کو گھیر لیا؛ میں مجبوراً تلوار ہاتھ میں لے کر میلے کچیلے ہجوم کو کاٹتا ہوا

---

۵۱ Parcae (مقدرات) کا لاطینی نام ہے ۵۲ Tera اہل رومہ کے علم الاصنام میں ایک دیوی کا نام ہے جس سے مقصود کرۂ ارض ہے ۵۳ Larisa شمالی یونان کی ایک قدیم سلطنت

ایک ہمسایہ مکان میں داخل ہوگیا۔ یہ میرے ایک خ[illegible] تھا، میں نے اس سے درخواست کی وہ اس الزام قتل سے میری بریت ثابت کر[illegible]یا کے کسی فرد کو قتل کیا ہوتا تو یہ سب ارعیت کے مقابلہ میں میری حمایت کر[illegible]ن کی طرح خود ایک رئیس تھا، اس نے کہہ دیا کہ وہ مجھ جیسے ذلیل اخلاق انسان [illegible]یکھیں گے!

"عالی منزلت جوو، یہی سبب تھا کہ میں اپنی جنس سے قطع تعلق کر لینے پر ایک عرصہ تک آوارہ گرد رہنے کے بعد بالآخر آج یہاں پہونچا ہوں، اور اس صحبت میں ہوں جو اعلیٰ ترین ہے، جس کی شرکت کی میں کبھی آرزو بھی نہ کر سکتا تھا۔"

"ماننا پڑتا ہے کہ تو ایک صاف گو حیوان ہے۔ اور نہایت سخت مصیبت میں مبتلا ہے۔ خیر، جس پر انسان بے رحم ہو جاتا ہے دیوتاؤں کو اس پر مہربان ہونا ہی چاہئیے۔ ظاہر ہے کہ سطح گیتی کی حالت موجودہ تیرے قیام کے لئے خطرناک ہے۔ اس لئے میں مناسب بہتر سمجھتا ہوں کہ تو کچھ د[illegible] پر ہم لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرے۔"

"جوو اعظم، تو حقیقت میں سب سے بڑا دیوتا ہے! میرے اس اظہار تشکر کو سو بیلوں کی قربانی کے برابر تصوّر فرما۔"

"میں بمشکل قیاس کر سکتا ہوں کہ ہماری طرز معاشرت تیرے مزاج کے مطابق ہوگی؛ ہمارا شام کا کھانا بعد غروب ہوتا ہے کیونکہ اپالو[1] اس قدر مصروف رہتا ہے کہ وہ اس سے قبل شریک ہو ہی نہیں سکتا، اور جب کھانے میں وہ شریک نہ ہو کچھ مزا نہیں آتا۔ صبح کے اوقات میں تو آزاد ہوگا اور جہاں بھی جو شغلہ دل چسپی تجھے پسند آئے تجھے کامل اختیار حاصل ہوگا۔ ڈائنا[2] تیرے لئے دلچسپ سیر و شکار مہیا کرے گی تجھے سیر و شکار سے شوق ہے؟"

"میرا نشانہ صحیح ترین ہوتا ہے۔ ایجیوشس[3] میرے لئے متفکر نہ ہو میں ہر حال میں بے تکلف ہوں، لیکن میں تیرے پاس تک پہونچوں گا کیونکر؟"

۱؎ Apollo آفتاب اور موسیقی و نظم کا دیوتا ۲؎ Diana ماہتاب و رصید و شکار کی دیوی۔

۳؎ Aegiochus جوو کا ایک نام۔

"میں مرکری[ط] کو تیرے لینے کے [illegible] ہونگا، جو تمام عالم میں بہترین رفیق سفر ہے، او ہو! میرا عقاب!"

(۲)

"اچھا تو اب سنبھلے رہو اور [illegible]ت کے ساتھ اُٹھاؤ! اپنا دل مضبوط رکھو کیا تمہاری طبیعت بگڑ رہی ہے؟"

"نہیں، صرف کسی قدر امتلا معلوم ہوتا ہے، سو وہ کچھ نہیں۔"

"یہ تو حرکت کا کرشمہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ کباب سے بہتر کوئی شے نہیں۔ طور پر ٹھہر کر ایک کباب ضرور کھائیں گے۔"

"مرکری، سُنا ہے تم نے بہت سیاحت کی ہے۔"

"بیشک۔ ساری دُنیا میری دیکھی ہوئی ہے۔"

"او ہو! کیسا تحیّر خیز نظارہ ہے! ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے بھی سیاحت کا بڑا شوق ہے۔"

"مگر ایک ہی چیز بار بار دیکھنے کو ملتی ہے! اس میں ندرت نہیں ہے، لیکن تغیر بیشک بہت ہے۔ میں تو اس سیر و سیاحت سے تنگ آگیا ہوں، مجھے تو اگر پنشن مل جاتی تو میں بہت خوش ہوتا۔"

"تاہم سیاحت سے عقل بڑھتی ہے۔"

"البتہ، اس سے تفکرات کا علاج ہوتا رہتا ہے۔ معائنہ و مشاہدہ کی کثرت سے حس کمزور ہو جاتی ہے اور ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ واقعات عظیمہ جو بصورت دیگر ہمیں اس قدر پریشان و متفکر کر دیتے ہیں، تجربہ و مشاہدہ کے بعد نہایت معمولی باتیں معلوم ہونے لگتی ہیں۔"

"یہ تو میں ابھی سے محسوس کر رہا ہوں، اس خلائے نیلگوں کی شناوری میں، مجھے اپنی بیوی اور اس کی ذلیل دُنیا کی کوئی ہستی نہیں معلوم ہوتی ہے، میرے دشمن مور و ملخ کی طرح حقیر نظر آتے ہیں! اور میرے قرض کے جھگڑے جو میری زندگی میں نہایت متاثل اور محزوں لمحات کا باعث ہوئے اُن کی کوئی حقیقت نہیں رہ گئی ہے۔ اب میرے نزدیک عزت یا ذلت، اعتبار یا گراگری کوئی جداگانہ مفہوم نہیں رکھتے اور تمسخر انگیز ہیں۔"

ط Mercury پیک فلک، جیوپیٹر کا قاصد۔

"ایکزیان، معلوم ہوتا ہے تمہارے خیالات [illegible] ہی صحیح معنے میں دُنیادار بنجاؤ گے
ذرا بائیں طرف رہو اور ستاروں سے بچے ہوئے [illegible]

"وہاں کون رہتا ہے"؟

"یہ بات مقدرات[51] جانتی ہیں، مجھے معلوم نہیں، [illegible] کی قوم رہتی ہے جو منصۂ شہود پر آکر چمکنے اور نمایاں ہو جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ غالباً کوئی نیا ستیارہ ہے جو حال ہی میں، اسی صدی کے اندر، خلا میں نمودار ہوا ہے۔ ہم لوگ وہاں نہیں جاتے"

"مجھے کچھ بھوک سی معلوم ہو رہی ہے"

"ہاں! اچھا تو ہم آسمانوں پر کھانے کے وقت سے قبل پہونچ جاتے ہیں؛ وہاں پہونچکر، ہمیں کھانے کے لئے تبدیل لباس کا وقت مل سکے گا۔ میں بھی اپنی اشتہا دوپہر کے کھانے سے قبل خراب نہیں ہونے دیتا کیونکہ جیوپیٹر کا باورچی مشہور ہے"

"میں نے آب نشاط[52] اور عنبریہ[53] کے متعلق بہت کچھ سُنا ہے"

"اوہ، ان کو تو کوئی چھوتا تک نہیں! یہ اکل وشرب کی چیزیں ہیں اور کھانے کے کمرے میں نمائشی میز پر محض زیبائش کیلئے رکھدی جاتی ہیں۔ اب آسمانوں میں عالمِ اسفل کے طباخی کی کوئی شے داخل نہیں ہوتی۔ ہم لوگوں کا باورچی پروسرپائن[54] کے پاس سے آیا ہے"

"تم نے کبھی جحیم کا سفر بھی کیا ہے"؟

"بارہا! اولمپس والوں میں تو اب فیشن ہو گیا ہے کہ زمستان وہیں بسر کریں"

"کیا آج کل آسمان والوں کا موسم نشاط ہے"؟

"البتہ، تم بڑے خوش قسمت ہو۔ اولمپس آج کل بھرا ہوا ہے"

"یہ جیوپیٹر کی عین عنایت ہے جو مجھے مدعو کیا"

"اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ اُسے تم سے اُنس ہے جو بجائے خود نہایت عمدہ بات ہے،

---

۵۱ رومن اور یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ تین Parcae یا مقدرات (Fates) ہیں جو مشترکہ طور پر انسان کی پیدائش، حوادث اور مسرت کی حکمراں ہیں ۵۲ شراب سماوی (Nectar) ۵۳ ماکول سماوی (Ambrosia) ۵۴ (Proserpine) زیر زمین کی دیوی۔

لیکن ذرا ہوشیار رہنا وہ سخت بھی [illegible] ہے۔ جس قدر اس کے مزاج میں تلوّن ہے، اتنا ہی تشدد بھی ہے۔"

"دیوتا انسان کے ساتھ اُتنے نا[illegible] ہے جتنا خود انسان، انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔"

"یہ ایک کلیہ ہے! جس پر مصیبت پڑی ہے وہ یہی سمجھنے لگتا ہے کہ اس نے انتہا دیکھ لی! لیکن یہ ایک شدید غلطی ہے۔ بہر حال اب تم اس شاہراہ پر ہو جو بلند طبقہ کو جاتی ہے۔ اب ہم افسردہ خاطر نہ رہیں گے، ہم میں کافی خوش طبع لوگ موجود ہیں۔ یقیناً تم بوڑھے۔ پنچوںؔ سے ملکر خوش ہو گے۔"

"کیا وہ بھی آج کل یہیں ہیں؟"

"ہاں، وہ بالعموم، گرما ہم لوگوں کے ساتھ بسر کرتا ہے، اس موسم میں سمندروں میں حرکت کم ہو جاتی ہے۔"

"مجھے مریخؔ سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔"

"وہ ایک تند مزاج اور شجاع ہونے کے بجائے صرف جھگڑا کرنے والا ہے اور کسی طرح اعلیٰ طبقہ میں شامل نہیں ہو سکتا۔ آج کل ایسے بانکوں کا طبقہ اولمپس میں بالکل مقبول نہیں ہے۔ اب خواتین میں ادبی مذاق عام ہو گیا ہے اور منروؔا نے وینس ؔ کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ آج کل اپالو ہمارا ہیرو ہے۔ تم اس کی آخری تصنیف ضرور پڑھنا۔"

"مگر مجھے تو پڑھنے سے نفرت ہے۔"

"یہ تو میری بھی عادت ہے! مجھے وقت ہی بہت کم ملتا ہے اور اخبار پر ایک سرسری نظر ڈال لینے کے سوا اس قسم کا مشغلہ شاذ ہی ہوتا ہے۔ مطالعہ اور سفر کبھی متحد نہیں ہو سکتے۔"

"میرا خیال ہے، کہ تمام دیویاں بے حد پُر غرور و پُر استغنا ہوں گی۔"

"نہیں، یہاں بھی تم وہی حالت دیکھو گے جو سطح زیر آسمان پر دیکھ چکے ہو، یعنی طبائع میں نیرنگی، مگر غایت و مدعا وہی ایک۔ وینس ذرا عشوہ پرداز ہے، منروا کسی قدر متکبر، کیونکہ اس کا خیال ہے کہ وہ

۱ے Neptune سمندر کا دیوتا ۲ے Mars جنگ کا دیوتا ۳ے Minerva علم و ہنر کی دیوی
۴ے Venus حسن کی دیوی۔

نہایت صحیح الذوق اور مستحکم مزاج رکھتی ہے اور چونکہ ... تی تمام کے متعلق میرا یہ مشورہ یاد رکھنا کہ بزدل کبھی ایک حسین عورت پر فتح ... نا کی کیا بات ہے ؟"

"نہیں، میں خوف تو نہیں کرتا، میرا نفس میری ... شش کر رہا ہے؛ میں سمجھتا ہوں کہ ہم بادلوں کو نیچے چھوڑ آئے ہیں، کیونکہ میں ایک د ... ی سطح اپنے نیچے دیکھتا ہوں جو دھندلی اور غیر مسطح ہے، جس طرح میں نے بعض اوقات دنیا میں وقت غروب، افق کے دامنوں میں بادلوں کو اس طرح مجتمع دیکھا ہے، گویا طغیان بحر نے کسی شدید پالے کے اثر سے دفعۃً ساکت و منجمد ہو کر ایک شکل اختیار کر لی ہے۔ اس طرح اس وقت اوپر کی فضا جس ہوا کی حامل ہے، کس قدر پر نور اور اس کا تنفس کس درجہ نکہت بیز معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ میں بمشکل سانس لے رہا ہوں، لیکن پھر بھی میری نبضیں عنوانِ شباب کی سرعت کے ساتھ چل رہی ہیں۔ درحقیقت میں اپنی حقیقی ہستی کے احساس سے معذور ہوا جا رہا ہوں، تمہارے وجود پر ایک تجلی نازل ہوتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے، تم دافنہ دیوتا نظر آ رہے ہو، کیا میں بھی اتنا ہی پر تجمل ہوں ؟ - - - - یہ، یہی آسمان ہیں ؟"

(۳)

یہ مسافر ایک وسیع اور پر تاب لاجوردی زینہ پر اُتر پڑے اور سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک خیابان حسین میں داخل ہوئے۔ باغ کی پر پیچ و خم روشوں پر راستہ خود بخود طے ہو رہا تھا، معطر جھاڑیاں شاداب و منور، پھولوں سی لدی ہوئی تھیں اور درختوں کے جھنڈوں میں عجیب غریب طیور، رنگین اور چمکیلے بال و پر لئے نغمہ سنجی میں مصروف تھے۔ ایک ناقابل مساحت قصر زرین جس کے سربلند گنبد اور برج مروارید سے بنائے گئے تھے اور طاق و در بلورین تھے، ان کے پیش نظر تھا، صدر دروازے پر حجر عقیق سرخ کا تھا، پروں والے جنات کا ایک گروہ متعین تھا، جنہوں نے سرگرمی کی پذیرائی، جب وہ اپنے ہمراہی کو ساتھ لئے ہوئے داخل ہوا، ایک تبسم کے ساتھ کی۔

"آقائے خداوندان و عالمیان، تبدیل لباس کر رہا ہے،" مائیا کے بیٹے نے اُن سے کہا "اور ہنگام تزئین میری حاضر باشی بھی ضروری ہے۔ آپ کے پہونچ جانے کی اطلاع بھی کر دوں گا۔ یہ آپ کے قیام

کے کمرے ہیں۔ نصف ساعت میں [illegible] ہوگا جب میں کھانے کے کمرے میں حاضر ہونے کے لئے واپس ہوں گا تو آپ کو بلانے آؤں گا۔ [illegible] کو ہو سکے گی، وہ وقت بھی اچھا ہوگا۔"

(۴)

"ایکزیان، آپ طیار ہیں؟"

"ہاں، مگر جود نے کیا کہا؟"

"وہ صرف مسکرا کر خاموش ہو رہا، کیونکہ اس وقت ایک نئی پوشاک پہن کر دیکھ رہا تھا، لیکن اب تو وہ ہونچکر بیٹھ بھی چکا ہوگا۔ آہا، جلدی کرو، گجر بج رہا ہے، آؤ۔"

یہ اب ایک ایوان میں داخل ہوئے۔ جس کی چھت مُدوّر تھی، صنوبر کی ایک وسیع اور گول میز کے گرد جس کی نقرئی پچہ کاری میں ٹیٹان[ف۱] کی جنگ کا منظر عدیم المثال حسنِ صنعت کے ساتھ پیش کیا گیا، اور جو ولکان[ف۲] کی طرف سے تحفۂ عروسی میں دی گئی تھی ہاتھی دانت اور سونے کے کام کی کرسیاں بچھی تھیں۔ طلائی ظروف اور اسباب کو دیکھ کر تخیل کی بلند ترین و بہترین تخییل نفاست تاریک گوشہ میں روپوش ہو گئی۔ میز کی وسیع سطح اپنی طلائی آرایش و ظروف سے اجتماعِ انجم و اختر کا حسین منظر بنکر رہ گئی تھی ایکزیان نے خداوندان و عالمیان کو بتدقیق تمام دیکھا؛ لیکن جود کسی وجہ سے اس کو نہ دیکھ سکا۔

ایکزیان نے اس کی عظمتِ پناہی و جلالت مآبی کا اعتراف کیا، جو بہ نیم اشارہ چشم سارے اولمپس کو لرزہ ناک کر دے سکتا تھا۔ شاہانہ وجاہت کا پیکر اور شدّت توانائی کا مجسمہ جس کے کشادہ سینہ کے مقابلہ میں تنگی کمر کا تناسب قدرتِ خداوندی کا رعب آفریں منظر تھا، اس کے زرّیں و پریشاں کاکلوں کے چھلے، اس کے ارغوان رنگ رخساروں پر کھیل رہے تھے، وہ رخسارے جو شبابِ دوام کی تاب سے دمک رہے تھے۔

پُر تمکنت جونو اس کے بائیں جانب تھی اور سیریس[ف۳] داہنی طرف، باقی مجمع میں پنچوں لٹونا[ف۴] منروا اور اپالو وغیرہ تھے اور جب مرکری اور ایکزیان اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکے تو ایک نشست ہنوز خالی تھی۔

ف۱ Titan ایک قدیم یونانی قوم جسے جیوپیٹر نے مغلوب کیا تھا۔ ف۲ Vulcan فن آہنگری کا نہایت قوی دیوتا۔

ف۳ Ceres رومن کے یہاں مادرِ گیتی کا نام تھا جو زمین کے پیداوار کی محافظ اور دیوی تھی۔ ف۴ Latona ڈائنا اور اپالو کی ماں

"ڈائنا کہاں ہے ؟" جوپیٹر نے کسی قدر چیں [illegible]

"میری بہن شکار میں مصروف ہے" اپا[illegible]

"وہ ہمیشہ کھانے کے وقت دیر کر دیتی ہے" جوپیٹر [illegible] یر دیوانہ عادت اور کیا ہو سکتی ہے" ؟

"خداوندانہ مشاغل سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ دیوانہ آداب کے محرک ہوں" جونو نے طنزیہ کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ ڈائنا اب آیا ہی چاہتی ہے" لٹونا نے نہایت نرمی کے ساتھ جواب دیا۔

جوپیٹر کی برہمی رفع ہوتی ہوئی معلوم ہوئی اور اسی لمحہ میں مہمان منتظر داخل ایوان ہوئی۔

"شکار خوب ہوا بچوں ؟" نے کہا

"نہایت خوب، چچا جان۔ اماں جان،" اپالو کی بہن نے جونو کو مخاطب کر کے سلسلۂ کلام جاری رکھا کیونکہ اُسے جب کبھی اس کے استرضا کی ضرورت ہوتی تھی وہ اسی طرح سے مخاطبہ کیا کرتی تھی "میں آپ کے لئے ایک نیا طاؤس لائی ہوں"

جونو کو اہلی جانوروں کا بہت شوق تھا، اور وہ اس تحفہ سے رضامند ہو گئی۔

"مرکری۔ باخوس ط نے اس شراب کی بڑی تعریف کی ہے،" جوپیٹر نے کہا "لیکن میرے خیال میں تو یہ کچھ ایسی وجہ تفاخر چیز نہیں ہے، تمہارا کیا خیال ہے ؟"

"مجھے تو اچھی معلوم ہو رہی ہے، لیکن میں کسی قدر تھکا ہوا ہوں اور ایسی حالت میں ہر شراب اچھی معلوم ہوتی ہے"

"البتہ تمہیں ایک طویل سفر کرنا پڑا" صاحب رعد و برق نے کہا "اگزیان میں تمہیں آسمانوں پر دیکھ کر خوش ہوں"

"جناب والا کا ورود آج ہی ہوا ؟" مرواے اگزیان سے دریافت کیا، شاہ تھسلی جس کے برابر ہی بیٹھا ہوا تھا۔

"جی ہاں اسی ساعت میں"۔

ط Bacchus شراب کا دیوتا۔

"اب آپ کو وقت کا شمار ... " منروا نے مستقل تبسم کے ساتھ کہا "فرمایئے یونان میں کوئی نئی بات ؟"

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ ... اطمینان جواب نہیں دے سکتا کیونکہ گذشتہ ایام میں مجھے سوسائٹی سے دُور رہنا پڑا۔"

"ہومر کی کوئی جدید اشاعت ؟ میں اس کی بے نہایت مداح ہوں"۔

"میرے لئے یونان کی ہر چیز اپنے اندر ایک جذب دلکشی رکھتی ہے" اپالو نے کہا جس کی وضع اس وقت یہ تھی کہ قمیص کے گلے کا بٹن کھلا ہوا تھا اور اس کی دراز کاکلیں ایکٹروں کی وضع پر سنوری ہوئی تھیں۔ وہ ہر چند ذی وجاہت، لیکن گونہ متالم و متفکر شخصیت رکھتا تھا "یونان کی ہر شے مجھے دلچسپ لوم ہوتی ہے، میں اُسے ہمیشہ اپنی ایسی ملکیت تصور کرتا ہوں، جو نہایت قیمتی اور عجیب و غریب ہو میری بہترین نظمیں وہ ہیں جو میں نے ڈیلفی[1] میں بیٹھ کر لکھیں۔ یونان کا سفر میں نے اس زمانہ میں کیا جب میرا بالکل عنفوان تھا، مجھے بنی نوع انسان پر رشک آتا ہے"۔

"کیا واقعی؟" ایکزیان نے سوال کیا۔

"جی ہاں، واقعی رشک آتا ہے؛ وہ کم از کم یہ توقع تو کر سکتے ہیں کہ ہستی کی تکان ایک روز رفع ہوجانے والی ہے۔ ہم اہلِ سما کے سامنے کون سا مستقبل ہے، ہ کہنے کو جو چاہے کہئے، لیکن غیر فانی ہونا ایک مصیبت ہے"۔

"اپالو تم تو کچھ کھاتے ہی نہیں" سیرس نے کہا

"پیتے بھی تو کچھ نہیں!" ہیچون بولا۔

"کھانے اور پینے سے مقصود زندگی کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا؛ اور زندگی کی غایت موت ہے۔ بشرطیکہ موت کا مفہوم وہی لیا جائے جو نوع انسان کے یہاں ہے۔ یعنی وہ چیز جو ناخوشگوار ہے، جس سے گریز دانا کیا جاتا ہے؛ اس لئے میں صرف سوڈے اور بسکٹ سے تازگی حاصل کرنے پر بس کرتا ہوں گنی میڈ[2] میرے لئے سوڈا لے آؤ۔"

---

[1] Delphi ایک قدیم و مشہور شہر جہاں اپالو کا بہترین مندر قایم تھا [2] Ganimede جو پٹیر کا جام دار ساقی

ہر چند اولمپس کا انتظام اور فن طباخی مکم[illegible]ی سے اس سماوی شاعر نے وہی دو چیزیں طلب کیں، جن سے اولمپس [illegible] تھا، آسمانوں پر نہ تو سوڈا ہی تھا اور نہ بسکٹ۔ چنانچہ سخت ہلچل پیدا ہو جانا یا[illegible] آخر کار شاعر فلک نے جس کا شوق ناموری اس کی فربہ اندامی کے مساوی تھا، ایک مسلم [illegible]یاب بوتل تیز شراب پر کفایت کی۔

”ہومر کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟“ منروا نے اپالو سے دریافت کیا ”کیا اس کا کلام فرحت انگیز نہیں ہے؟“

”اگر تم ایسا خیال کرتی ہو تو۔“

”یہ نہیں میں تو تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔“

”اگر ایسا تھا تو تم نے اپنی رائے ظاہر نہ کی ہوتی، کیونکہ تمہارا ذوق میرے نزدیک اس قدر صحیح ہے کہ میں اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتا۔“

”کچھ عرصہ سے مجھے یہ شک ہو گیا تھا کہ تم بدعتی ہو گئے ہو۔“

”خوب! واقعہ یہ ہے کہ“ اپالو نے جواب دیا ”میں ہومر کو اتنا اعلیٰ نہیں سمجھتا؛ وہ خود اپنے ہی زمانہ میں قدر کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ بالعموم ہمارے معاصرین ہمارے بہترین حکم ہو سکتے ہیں اور حقیقتاً ذوق طبیعت پر فیصلہ صادر کر دینے کی اہلیت رکھنے والے چند ہی افراد ہوتے ہیں۔ بلکہ ہوتے ہی نہیں۔ ایک خاص طبقہ خاص دلائل کی بنا پر کسی خاص انشا پرداز کے متعلق شور و غوغا کر لینے کا تہیہ کر لیتا ہے اور عوام اُن کا اقتدا کرتے ہیں؛ اور ہومر کی مقبولیت اس سے ذرا بھی کم و بیش نہیں ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں نے اس سے بہت کچھ اخذ کیا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے بچپن ہی سے ہومر کو نہیں پڑھا اور اس کے متعلق میری جو رائے اب ہے وہی اس وقت بھی تھی۔ ایک غیر محتاط مگر عظیم قدرت رکھنے والا، لیکن بالکل ناقص المذاق انشا پرداز! اسے تسلیم کیجئے کہ ہمارے ہم عصر ہی ہمارے بہترین حکم ہو سکتے ہیں۔ ہومر کے معاصرین نے فیصلہ کر دیا تھا کہ ہومر کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر کبھی اس طرح نہیں گرایا جا سکتا، مجھی کو دیکھئے مرسیاس[1] نے میری پہلی تصنیف کے متعلق کہا کہ وہ

---

[1] Marayas فریجیا کا ایک نے نواز اپالو کا حریف، جو اپالو سے مقابلہ کرنے میں شکست کھا گیا۔

ایک دیوتا کی شاعری ہونے کے لحا[illegible] ہے۔ میں نے طنزیہ مضمون کے ذریعہ سے اس کو پوست کندہ جواب دیا۔ لیکن [illegible] کیا ہے، اور خود زندگی کیا ہے؟ محض ہوا۔ آپ جانتی ہیں ہوا کیا ہے؟ میں خو[illegible] واقف نہیں ہوں، مگر ہر شئے ایک راز اور ہر چیز ایک تکدر معلوم ہوتی ہے، وقتاً فوقتاً بادلوں کے اندر سے ایک ستارہ نمودار ہوتا ہے اور چمکتا ہے، یہ ستارہ ہی شعر ہے۔

"نہایت خوب!" منروا پکار اٹھی۔

"میں تمہیں کماحقہ نہ سمجھ سکا" بیچون نے کہا۔

"پراسرپائن کے پاس سے تمہیں کوئی تازہ اطلاع ملی ہے؟ جوپیٹر نے سیریس سے دریافت کیا۔

"ہاں مجھے کل ہی خبر ملی ہے" مہتمہ نے جواب دیا "کہ وہ عنقریب آنے والے ہیں، لیکن پلوٹو نہایت مصروف ہے، کیونکہ اس زمانہ میں جنگ کی تعداد میں حیرتناک ترقی ہوئی ہے، مجھے تو اندیشہ ہے کہ وہ پراسرپائن کے ہمراہ شاید ہی آسکے"

جونو اور سیریس میں ایک برقی اشارۂ چشم کا تبادلہ ہوا۔ تمام دیویاں کرسی چھوڑ کر کمرے سے رخصت ہوگئیں"

"آداب ایکزیان!" جوپیٹر نے اپنی عظمت کو بالائے طاق رکھ کر کہا "میں تمہارے خیر مقدم میں دوآتشہ کا ایک جام نوش کرتا ہوں۔ آپا تو شاعری کا قصہ چھوڑو۔ مرکری کوئی عمدہ سا فسانہ سناؤ"

(۵)

"منروا تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟" جونو نے سوال کیا۔

"میں اُسے نہایت ذہین سمجھتی ہوں" منروا نے جواب دیا۔

"واہ! اس کی آنکھیں نہایت حسین ہیں!" جونو نے کہا۔

"وہ ایک نہایت خوبصورت شریف نوجوان ہے" سیریس بولی۔

"اس میں شک نہیں کہ وہ نہایت ہردلعزیز ہے" لٹونا کہنے لگی۔

"مگر یہاں اسے سخت تکلف محسوس ہوا ہوگا" ڈائنا نے کہا۔

---

۵ Pluto پراسرپائن کا شوہر جہنم یا زمین کے اندرونی حصہ کا دیوتا۔

ہرقلس[1]، اپنی بیوی ہیبی[2] کے ساتھ آ... [illegible] ...میں پہونچ گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میوزین[4] آئیں۔ تھیلیا[5] میلپومینی[6] اور ٹر... [illegible] ...اور پھبتی کہنے میں مشہور تھی، آگئیں، کیونکہ شام کے وقت جوپیٹر لطف و لذ... [illegible] ...سے خوش ہوتا تھا۔ باخوس بھی آگیا، لیکن یہ دیکھکر کہ دیوتاؤں نے اپنے شغل مے نوشی سے فرصت نہیں پائی ہے دوبارہ واپس آنے کے ارادہ سے واپس چلا گیا۔

(۷)

گنی میڈ نے جونو کو اطلاع دی کہ سالون میں کافی طیار ہے جوپیٹر اس وقت بہترین حالت مسرت میں تھا اور اُسے اپنے انسانی مہمان کے سبب سے بے حد خوشی تھی۔ چنانچہ وہ اپنا ایک بہترین فسانہ اپنے دلکش ترین طرز ادا میں سنانے کے لئے آمادہ ہوگیا۔ اس کی یہ تصنیف لیڈا[8] کے متعلق تھی اور دوسری تصانیف کی طرح بہت زبوں و فحش نہ تھی، بلکہ فرحت بخش تھی۔

"وہ بھی کتنا خرم و پُر رونق زمانہ تھا!" میچن نے کہا۔

"ہاں"، صاحب رعد و برق کہنے لگا، "ہم لوگ اس زمانہ کی یاد سے تو خوش ہو سکتے ہیں آج کل کے نوجوانوں کو بدقسمتی سے نہایت خراب زمانہ ملا ہے، آج کل اتنی نازک و نازنین عورتیں بھی پیدا نہیں ہوتیں۔ ایکزیان میں تمہاری بیوی کا جام صحت پیتا ہوں۔"

"نہایت مسرت کے ساتھ، لیکن خدا نہ کرے کہ ہم دونوں کا موجودہ فاصلہ کمتر ہو جائے۔"

"اباآلو، مجھے اپنا ہاتھ دو۔ یہ جام خواتین کی یاد میں۔"

(۸)

صاحب رعد و برق، جونو کے سالون میں داخل ہوا اور تعظیم کے اس انداز خم کے ساتھ،

۱؎ Hercules ایک نہایت قوی انسان جو اپنی قوت کی وجہ سے دیوتاؤں میں شامل ہوگیا ۲؎ Hebe آسمانی ساقیہ اور شباب کی دیوی ۳؎ Graces تین بہنیں میوزوں کی سہیلیاں ۴؎ Muses جوپیٹر اور نیموسن کی نو لڑکیاں ۵؎ Thalia نو میوزوں میں سے ایک میوز، مضحکات کی دیوی ۶؎ Melpomene نو میوزوں میں سے ایک میوز، غم والم کی دیوی ۷؎ Terpsicore رقص کی دیوی۔ ۸؎ Leda جوپیٹر کی عارضی محبوبہ، ہیلن کی ماں۔

جیسے کوئی دوسرا دیوتا ادا نہیں کر سکتا [illegible] ے ہو گئے اور شاہِ سماوات، اسپرتس اور لیٹونا کے بیچ میں بیٹھ گیا۔ اپالو علیحدہ کھڑا رہا [illegible] جلس کی شرکت کے لئے لے گئی جو نموسٹین۱؎ کے مکان پر منعقد ہو رہی تھی۔ مرکری [illegible] ں کرتا رہا اور باخوس، ڈائنا کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ میوزوں نے صحبت کو اپنے فن موسیقی سے محظوظ کیا اور ملکہ سما، ایکزیان کی جانب متوجہ ہوئی۔

"آپ رقص فرماتے ہیں ؟" جونو نے ایک مغرورانہ انداز کے ساتھ ایکزیان سے دریافت کیا۔

"زمین پر مجھے دو ایک ہی باتوں میں سلیقہ حاصل تھا، آسمانوں پر تو مجھے کہنا چاہیئے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

"آپ کی زندگی بھی عجیب و غریب طریقہ پر بسر ہوئی، میں نے آپ کے سوانح و حوادث سنے ہیں۔"

"ایک بادشاہ جو اپنا تاج و تخت کھو چکتا ہے بالعموم اُسے کچھ نہ کچھ تجربہ ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔"

"آپ کی ہمت نہایت مستحکم ہے !"

"جی ہاں، میں بہت زیادہ کی تمنا کرنے کی سزا اُٹھا چکا ہوں، کل میں وہ آوارہ گردہستی تھا جو طوفان کی بے رحمیوں کا صید تھا، آج میں جودِ اعظم کا مہمان ہوں۔ سانس کے ساتھ آس ہے اور جو شخص تقدیر پر ہنستا ہے کامیاب رہتا ہے۔ میں خوشگوار ماضی سے گذر جانے پر اس لئے آمادہ ہوں کہ لطفِ حال سے بہرہ اندوز ہو سکوں۔ بہرنوع میں اپنی بیوی کا ممنونِ احسان ہوں، کیونکہ اس کی خوش سلوکی کا نتیجہ ہے کہ میں اس وقت آپ کے نظارۂ جمال سے شادکام ہوں۔"

"یہ نظارہ تو ایسا عجیب و غریب نہیں ہے ! اور اگر ایسا ہو بھی تاہم میں آپ کے لئے بہتر نصیب کی خواہشمند ہوں۔"

"مگر میں کسی عظیم ترشے کا متمنی نہیں ہوں۔"

"آپ بہت زیادہ اعتدال پسند واقع ہوئے ہیں۔"

"میں شاید اُس سے زیادہ غیر معقول پسند ہوں، جتنا آپ خیال فرماتی ہیں۔"

"سچ !"

دونوں کی آنکھیں مقابل ہوئیں، ایکزیان کی آنکھ، دیوی کی تابشِ جلوہ کے سامنے مغلوب نہ ہوئی، جونو کا رنگ زرد پڑ گیا، اور پھر وہ اُٹھ کر چل دی۔ (باقی)

ل۔ احمد

۱؎ Mnemosyne جوپیٹر کی مطلقہ بیوی۔

حرکتِ گ... ں

عام خیال ہے کہ علومِ جدیدہ لوگوں میں الحاد و ... ت پیدا کرتے ہیں لیکن میرے نزدیک ایسا سمجھنا بالکل ایسا ہے جیسے خدا کا انکار کر دینا، صرف اس دلیل کی بنا پر کہ وہ ہمیں نظر نہیں آتا۔

ایک معمولی آدمی دیکھنے کے معنی صرف یہ لیتا ہے کہ کوئی چیز مجسم حالت میں اس کی آنکھوں کے سامنے آجائے لیکن ایک صاحبِ علم و ہوش جانتا ہے کہ چھونا، سونگھنا، چکھنا، سننا اور اس سے زیادہ صرف کسی بات کو سمجھ لینا بھی دیکھنا ہی ہے، کیونکہ دیکھنا اپنے زیادہ وسیع معنے میں نام ہے اس ادراک کا جو نفس (mind) کے ذریعہ سے ہمیں حاصل ہوتا ہے، اس لئے اگر ایک ہیئت داں یہ کہتا ہے کہ میں حرکتِ اجرام کو دیکھتا ہوں، اگر ایک ماہر کہربائیت دعویٰ کرتا ہے کہ تموجاتِ برق مجھے نظر آتے ہیں، اگر ایک عالمِ کیمیا مدعی ہے کہ پانی کے تمام اجزاء اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں اور اگر ایک ماہرِ طبعیات کہتا ہے کہ وہ کائنات اور کائنات کے ذرہ ذرہ کو گردش میں دیکھتا ہے تو آپ اس وجہ سے انکار نہ کیجئے کہ آپ اس کے دیکھنے سے عاری ہیں بلکہ اس کو تسلیم کیجئے یہ سمجھ کر کہ خدا کی قدرت کے مظاہر و آثار غیر متناہی ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ موجودات کے اندر کس کس رنگ کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

زمانۂ قدیم میں زمین کو مسطح اور چپٹی جانکر آسمان کو اک گردش کرنے والے سرپوش کی طرح سمجھتے تھے جس میں سورج جڑا ہوا تھا اور خدا کی قدرت کی یہ نشانی نہایت عجیب و غریب سمجھی جاتی تھی، لیکن اگر علومِ جدیدہ کا ماہر کہتا ہے کہ خدا کی دنیا اس قدر وسیع ہے کہ اگر یہ تمام نظر آنے والے ستارے، سورج، چاند، زمین، ایک دم فنا ہو جائیں، تو موجوداتِ عالم کو اتنا بھی نقصان نہیں پہونچتا، جتنا سمندر کو ایک قطرے کے ضائع ہونے سے ہو سکتا ہے، اگر ایک ہیئت داں تم کو بتاتا ہے کہ زمین کے ساتھ اور بھی اتنے بڑے کرے ہیں کہ سینکڑوں زمینیں ان میں سما جائیں۔ آفتاب کے گرد ہزاروں میل فی گھنٹہ کے رفتار سے گردش کر رہے ہیں اور پھر سورج بھی اپنے تمام نظامِ شمسی کے ساتھ کسی اور کرہ کا

طواف ۲۴ ہزار سال میں کر لیتا ہے، تو کیا ... اس بیان میں خدا کی قدرت کی اور زیادہ کھلی ہوئی عجیب و غریب نشانیاں نہیں ...

ایک ڈاکٹر بیان کرتا ہے ... چھوٹے سے قطرہ میں جو سوئی کی نوک پر ٹھہر رہا ہے کروڑوں جاندار کیڑے موجود ہیں ... سن کر ہنستے ہو، شاید اس وجہ سے کہ خدا ایسا کرنے پر قادر نہیں ہے!

دوسرا عالم دعویٰ کرتا ہے کہ دُنیا کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی ان لاکھوں ذروں سے مرکب ہے جو ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں تو تم یقین نہیں کرتے غالباً اس لئے کہ خدا کی قدرت کو تم اس قدر وسیع خیال نہیں کرتے!

لیکن یاد رکھو کہ انسانی افکار جس قدر ترقی کرتے جائیں گے، اسی قدر زیادہ ہم کو مظاہر قدرت و ناظر فطرت کا وقوف ہوتا جائے گا۔ اور جس قدر ہم اُن کے حالات سے زیادہ آگاہ ہوں گے۔ اسی نسبت سے ہم کو خدا کی قدرت کا زیادہ یقین ہوتا جائیگا!

یہی وہ خیال تھا جس کی بنا پر ہم نے مسائل ہیئت کے متعلق نگار میں مختلف مضامین شائع کئے (اور کرتے رہیں گے) تاکہ لوگوں کے افکار میں زیادہ وسعت پیدا ہو اور وہ سمجھ سکیں کہ خالق و مخلوق کے درمیان جو رشتہ قایم ہے وہ کس حد تک استوار ہے اور ہماری ہستی کائنات عالم میں کیا ہے؟

پھر جس طرح علم ہیئت اس لحاظ سے حد درجہ دلچسپ علم ہے اسی طرح طبیعیات، علم الکیمیا بھی ہیں اور آج کی صحبت میں ہم تمہیں حرکت کے کرشمے بتاتے ہیں کہ وہ کس حد تک نظام کائنات پر موثر ہیں اور مخلوقات عالم باہمدگر کس قدر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

یہ مضمون کئی نمبروں میں ختم ہوگا اور کوشش کی جائے گی کہ ہر مہینہ ایک بحث ختم کر دیجائے۔ انگریزی میں متعدد کتابیں ان فنون پر موجود ہیں، لیکن اُردو (جس میں آج تک وضع اصطلاحات ہی کی بحث ختم نہیں ہوئی) ایسے مضامین سے یکسر محروم ہے، درانحالیکہ اصل مقصود تو مضامین کا لکھنا ہے! جن سے خود اصطلاحات قایم ہو سکتی ہیں (دُنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جسمیں پہلے اصطلاحات وضع کر لی گئی ہوں)

اس سلسلہ مضامین کو جو نقول احدا... سے ماخوذ ہے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ ایسے خ... ذوق لوگوں میں عام ہو جائے

قوانین حرکت

ہم دیکھتے ہیں کہ بندر انسان کی نقل کرتا ہے، بچہ والدین کی تقلید کرتا ہے، وضع لباس تقلید ہی کی قوت سے لوگوں میں سمندر کی موج کی طرح پھیل جاتا ہے، موسیقی جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر ستار کے ایک تار کو حرکت دی جائے تو اس کے قریب کے تار سے بھی وہی آواز نکلے گی جو پہلے تار سے نکلتی ہے۔

بعض افراد کے درمیان الفت اور اُنس ہوتا ہے اور بعض کے درمیان نفرت وعداوت، علم وظائف الاعضاء (Physiology) کے ماہرین کہتے ہیں کہ ہم آواز اِس لئے سُنتے ہیں کہ آواز پیدا کرنے والے جسم کے اہتزازات (vibrations) ہوا میں امواجِ صوتی پیدا کرتے ہیں، یہ موجیں حرکت کرتی ہوئی کان کے پردہ سے ٹکراتی ہیں اور اس سے اعصابِ سماعت متاثر ہو کر دماغ کو مطلع کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فوجی باجہ سے سپاہیوں کے قدم باقاعدہ پڑتے ہیں، کائنات میں لاکھوں قسم کی مادی، حیوانی، عقلی اور اجتماعی حرکات ہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ مختلف صورتیں اختیار کرتی ہوئی منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حرکت کے کرشمے خاص روابط اور علایق کے تحت میں نمودار ہوتے ہیں، اور ان روابط اور علائق کی بنا چند غیر متبدل طبعی اصول پر ہے، اِن ہی اصول وقوانین کا دریافت کرنا ہمارے مضمون کا موضوع اصلی ہے لیکن اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے حرکت طبعی کے چند قوانین کا بیان کر دینا ضروری ہے۔

حرکت کیا چیز ہے؟ ایک خاص مدت اور خاص مسافت میں کسی قوت کا کسی مادہ پر اثر کرنا حرکت کہلاتا ہے۔ تم نے پتھر پھینکا، پتھر مادہ ہے، جس کو ہاتھ کی قوت نے پھینکا اور اس نے چالیس فٹ مسافت دو ثانیہ میں قطع کی۔ گولہ کا توپ کے مُنہ سے نکل کر ایک مخصوص حد تک پہونچنا حرکت ہے۔ جاذبیت ارض کی وجہ سے پانی کا بہنا حرکت ہے۔ عضلات کی قوت سے انسان کا چلنا حرکت ہے

ہنسا حرکت ہے، کلام حرکت ... یرہ وغیرہ۔

انتقالِ حرکت | اگر ایک ہموار س... یک دوسرے کرّے کو اس کی طرف لڑھکائیں، تو وہ حرکت کرتا ہوا اس سے متص... ن ہو جائے گا، اور کرہ ساکن میں اس کی حرکت منتقل ہو جائے گی اور کرہ اول کی حرکت میں جو زور باقی رہ گیا تھا، اس کو یہ کرہ پورا کر کے ساکن ہو جائے گا۔

گولہ جو توپ کے مُنہ سے نکلتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی دُور جائے، مگر زمین پر ضرور گرے گا، کیونکہ جب بارود کی قوتِ دافعہ پر زمین کی جاذبہ غالب آجائے گی، تو وہ اُسے زمین پر گرا دے گی، مگر اس کی حرکت، زمین پر گرنے سے ختم نہیں ہوگی، بلکہ دوسرے اجسام میں منتقل ہو جائے گی، جب ہوا کو گولہ چیرتا ہوا آیا ہے، اس میں سخت تموّج پیدا ہو جاتا ہے، جس سے قریب کے مکانات ہل جاتے ہیں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جاتے ہیں؛ اور اس تموّج کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے فضا، کو بھر دیتا ہے اور جب گولہ زمین پر گرتا ہے تو اس کی وجہ سے زمین ہلنے لگتی ہے اور زمین کی یہ اہتزازی حرکت پھیلتی ہوئی پورے کرۂ ارض پر محیط ہو جاتی ہے۔ اور زمین ہی تک منحصر نہیں رہتی بلکہ یہ حرکت ایتھر میں منتقل ہو کر ساری فضا میں پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح ٹرام اور ریل کی حرکت بھی، زمین، ہوا اور ایتھر میں تموّج اور اہتزاز پیدا کرتی ہے۔ لیکن اگر انتقالِ حرکت میں، جانب مخالف سے کوئی دوسری حرکت منتقل ہوتی چلی آرہی ہے، تو اگر دونوں، قوت و ضعف میں برابر ہیں تو تصادم سے دونوں حرکتیں ختم ہو جائیں گی اور اگر ایک قوی اور دوسری ضعیف ہے تو قوی حرکت باقی رہے گی لیکن تصادم سے بمقدار اس قوت کے ضعیف ہو جائے گی، جو ضعیف حرکت میں پائی جاتی تھی۔

طوال حرکت | ٹرام، میکانکی حرکت سے چلتی ہے، میکانکی حرکت، قوتِ برقی سے پیدا ہوتی ہے جو برقی تار کے ذریعہ سے ٹرام کے پہیوں تک پہونچتی ہے۔ برقی قوت ڈینمو (Dynamo) کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ڈینمو کی حرکت، بخار سے پیدا ہوتی ہے اور بخار حرارت سے پیدا ہوتا ہے اور حرارت ایندھن کے اشتعال سے، جس کی قوتِ مشتعلہ مادہ نباتی کے دقائق میں پوشیدہ ہوتی ہے؛ اور یہ قوتِ اشتعالی ایتھر کے تموّجات سے پیدا ہوتی ہے جن کا ظہور کرۂ شمسی کی حرارت سے ہوتا ہے۔

لکھنا ایک عضلاتی اور عقلی حرکت ہے، عضلاتی حرکت ہاتھ کے اعصاب سے پیدا ہوتی ہے،

اعصاب کی حرکت اس کیمیائی عمل کا نتیجہ ہے، جو [illegible] ریہ عمل اس کیمیائی اور فزیالوجیکل عمل سے پیدا ہوتا ہے جو جسم اور حاصل [illegible] ہے اور غذا اس کیمیائی عمل کا نتیجہ ہے جو ہماری نباتی خوراک پر حرارت شمسی کی [illegible] ت عقلی نتیجہ ہے مراکز دماغی اور مجموعِ عصبی کی حرکت کا اور یہ دونوں حرکتیں ایک کیمیائی [illegible] بیل عمل سے پیدا ہوتی ہیں، جس کا سلسلہ بہ تفصیل مذکور آفتاب کی حرارت تک پہونچ جاتا ہے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ حرکت ایک جسم سے دوسرے جسم میں کبھی تو بالکل سادہ طریقہ سے منتقل ہو جاتی ہے اور دوسرے جسم میں پہونچکر اس کی نوعیت نہیں بدلتی اور کبھی ہر مرتبہ ایک نئے لباس میں نمودار ہوتی ہے۔ حرارت، نور، مقناطیسیت اور میکانکیت یہ سب مظاہر حرکت ہیں، پھر تحولِ حرکت کبھی بواسطہ ہوتا ہے اور کبھی بلا واسطہ۔ ہاتھ کی حرکت سے چقماق میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے، برقی رو سے نور، اور حرارت پیدا ہوتی ہے، حرکت کی تمام انواع پیدا کرنے کے لئے صرف زمین کی جاذبیت کافی ہے، مثلاً کسی آبشار پر ایک برقی مشین لگادی جائے تو ظاہر ہے کہ آبشار کا پانی جاذبیت زمین کی وجہ سے گرتا ہے، گرتا ہوا پانی اس مشین کو حرکت دیتا ہے اور اس تحریک سے برق، روشنی، حرارت اور میکانکی حرکات سب پیدا ہو سکتے ہیں۔

استمرارِ حرکت پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ سلسلہ حرکات، حرارت شمس پر منتہی ہوتا ہے اور حرکت متحولہ کے حدود کی انتہا بھی ہمارے حدود ادراک سے خارج ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آفتاب میں یہ قوت کہاں سے آئی تمام کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی وجہ سے حرکت میں ہے اور ہر لمحہ میں لاکھوں تحولاتِ حرکت ہوتے رہتے ہیں اور یہ حرکت کب ختم ہوگی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے، جس کے حل کرنے سے عقول بشری بالکل قاصر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ عقل یہ ادراک کر سکتی ہے کہ حرکات دائمی اور مستمر ہیں اور اس کی ابتدا و انتہا بالکل مجہول ہیں۔

حرکت کا رُخ ظاہر ہے کہ حرکت، قوتِ محرکہ سے متاثر ہو کر خط مستقیم اختیار کرتی ہے اور غیر متناہی حدود تک چلی جاتی ہے، لیکن اگر ہم سے کہا جائے کہ واقعہ اس کے خلاف ہے تو ہم فوراً اس کا سبب تلاش کریں گے۔

اگر جہاز پر سے ایک توپ چلائی جائے تو ظاہر ہی ہے کہ گولہ خطِ مستقیم پر حرکت کرے گا، لیکن واقعہ

اِس کے خلاف ہے گولہ ہمیشہ خطِ م [illegible] اور جس قدر زیادہ مسافت طے کرتا ہے اسی قدر انحنا (Curvature [illegible] ـہ زمین کی قوتِ جاذبہ گولہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے گولہ کی حرکت پر ایک اور چیز [illegible] ، اور وہ یہ ہے کہ جب گولہ توپ سے نکل کر ہوا کو چیرتا ہوا جاتا ہے، تو تصادمِ ہوا سے اِس کی طاقت کمزور ہوتی جاتی ہے، اور جس قدر یہ طاقت کمزور ہوتی ہے اسی قدر زمین کی جاذبیت اس پر زیادہ اثر کرتی ہے۔ لیکن یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ تصادمِ ہوا سے گولہ کی جتنی قوت ضائع ہوتی ہے وہ حقیقت میں ضائع نہیں ہوتی بلکہ گولہ سے ہوا میں منتقل ہو گئی کیونکہ گولہ اثنائے حرکت میں ہوا کو چیرتا اور اس میں تلاطم پیدا کرتا ہوا جاتا ہے۔

مذکورۂ بالا بیان سے ہم اس قاعدہ کو استنباط کر سکتے ہیں، جیسا کہ نیوٹن کہتا ہے:-

"ہر جسم کا دو حالتوں پر استمرار ضروری ہے، یا ساکن رہیگا، یا غیر متغیر سرعت کے ساتھ خطِ مستقیم پر متحرک رہے گا، بشرطیکہ اس پر کوئی دوسری مخالف قوت اثر نہ کرے"

لیکن چونکہ صرف ایک قوت سے جسم کا متحرک ہونا محال ہے بلکہ وہ مختلف قوتوں سے اثر پذیر ہو کر حرکت کرتا ہے، اِس لئے اختلافِ محرکات سے سمتِ حرکت اور رفتار وغیرہ میں فرق پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا ہم کو سمتِ حرکت کا قانون اس طرح قایم کرنا چاہیئے:-

ا۔ جب کوئی جسم صرف قوائے جاذبہ سے متاثر ہو کر حرکت کرتا ہے، تو اِس کی حرکت ٹھیک ان ہی خطوط پر ہوتی ہے جو قوتِ جاذبہ سے حاصل ہوتے ہیں، مثلاً زمین کی قوت جاذبہ اپنی سطح کے ہر طرف سے اجسام کو خطوطِ مستقیم پر جذب کرتی ہے، لہٰذا اگر کوئی جسم زمین پر گرے گا تو جب تک اس کی سمتِ حرکت کو کوئی دوسری قوت متغیر نہ کرے گی وہ ہمیشہ زمین کی قوتِ جاذبہ کے خطوطِ مستقیم پر حرکت کرتا ہوا زمین پر گرے گا۔

۲۔ جب کوئی جسم قوائے جاذبہ کے اثر سے متحرک ہوگا، تو اِس کی سمتِ رفتار ان ہی خطوط پر ہوگی جو قوائے دافعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر بندوق کا منہ ٹھیک آسمان کی طرف کر کے گولی چلائی جائے تو وہ خطِ مستقیم پر صعود کرے گی، کیونکہ بارود کی قوتِ دافعہ نے خطِ مستقیم پر گولی کو دفع کیا ہے؛ اگرچہ اِس صورت میں زمین کی قوتِ جاذبہ بھی گولی پر اثر کر رہی ہے مگر اس کی سمتِ رفتار کو نہیں بدل سکتی۔

۳۔ جب کوئی جسم قوائے جاذبہ اور د [illegible] اس کی سمت رفتار، اس خط پر ہوگی جو دافعہ اور جاذبہ کے مشترک عمل [illegible] ی توپ چلائی جا[illegible] تو اس کا گولہ خط مستقیم پر حرکت نہیں کرے گا ب[illegible] ی جاذبہ قوت کے مشترکہ عمل سے منحنی خط پر متحرک ہوگا، جس کی تفصیل ہم اوپر [illegible] اس کے علاوہ ہوا کا تصادم اور ہوا کی حرکت بھی سمت رفتار میں فرق ڈالتی ہے، جیسا کہ صحیح تخیل سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔

اجرام سماوی کی سمت حرکت بھی مختلف قوتوں کا نتیجہ ہے، چنانچہ تمام اجرام، غیر متصل دوائر پر حرکت کرتے ہیں، جس کی تفصیل آیندہ بیان سے معلوم ہوگی۔

حرکتِ دَوری

حرکت کے مذکورہ قوانین کے علاوہ ایک اور مہتم بالشان قانون ہے جو مواد کی تحویل اور اِن کی کیفیات بدلنے پر بڑا اثر رکھتا ہے، اور اس کو حرکت دَوری کہتے ہیں۔

اس قسم کی حرکت تم کو لچکتی ہوئی شاخ، لہراتے ہوئے پھریرے، کپکپاتے ہوئے تار اور گھڑی کے رقاص (Pendulum) میں نظر آتی ہے۔

اس قسم کی حرکت کو ذہن نشین کرنے کے لئے ہم رقاص کی حرکت پر غور کرتے ہیں۔ اگر تم رقاص کو جبکہ وہ سکون کی حالت میں ہو پکڑ کر ایک طرف کھینچ کر چھوڑ دو تو وہ اپنی اصل جگہ (یعنی زمین کے خط مرکزی) پر پہونچکر ساکن نہ ہوگا، بلکہ اس سے تجاوز کرتا ہوا تقریباً اتنا ہی دور پہونچ جائے گا، جتنا کہ تم نے اس کو اصلی جگہ سے علیحدہ کیا تھا، اور پھر اسی طرح اپنی حرکت جاری رکھے گا، جب تک کہ وہ قوت جس نے اُسے ڈھکیلا تھا باقی ہے (مثلاً گھڑی کا رقاص جس کو ہر جدید حرکت میں کمانیہ ڈھکیل دیتا ہے) لیکن اگر یہ دافعہ قوت نہ رہے تو آہستہ آہستہ پچھلے دَور کی مسافت اگلے دَور سے کم ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ وہ ساکن ہو جائے گا۔

اگر تم رقاص کے کپکپاتے ہوئے تار پر غور کرو تو وہ بھی رقاص کے اصول پر اہتزازی حرکت کرتا ہوا نظر آئے گا۔

اسی طرح جب گھڑی کی بال کمانی بھی ان ہی اصول کے ماتحت سکڑتی اور پھیلتی رہتی ہے اور اسی طرح جب ہوا ایک دفعہ چل کر رک جاتی ہے یا مساوی سرعت سے اس کے متعدد جھونکے آتے ہیں،

تو درختوں کی شاخوں میں لچک ... پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ حرکت دوری چاہیے وہ کسی مادہ میں پائی ... کے تحت میں ہوتی ہے۔ لہذا اس اجمال کو واضح کرنے کے لئے حرکتِ رقاص ... متعین کر لینے چاہئیں۔

۱۔ رقاص کی آمد و رفت ایک معین فاصلہ میں مساوی اوقات میں ہوتی ہے اور قوتِ دافعہ کے قوت و ضعف سے اس میں فرق نہیں پڑتا (یہی وجہ ہے کہ گھڑی کوک دینے سے تیز نہیں چلتی بلکہ ہفتہ بھر ایک ہی رفتار سے چلتی ہے)

۲۔ رقاص کی آمد و رفت میں نوعیتِ مادہ اور تفاوتِ وزن سے فرق نہیں پڑتا، بلکہ اس میں فرق پڑنے کی دو صورتیں ہیں۔

الف۔ لمبا رقاص آہستہ اور چھوٹا تیز حرکت کرتا ہے۔

ب۔ جن مقامات پر زمین کی جاذبیت زیادہ ہوتی ہے وہاں حرکتِ رقاص سست ہوتی ہے اور جہاں جاذبیت کم ہوتی ہے وہاں تیز ہوتی ہے۔

۳۔ رقاص کے طول اور اوقات حرکت میں مربع کی نسبت ہوتی ہے، یعنی طول رقاص اوقات کے مربع کے برابر ہوتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے اصول سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رقاص کی آمد و رفت بلحاظ طول کے مختلف ہوتی ہے (رقاص کے مادہ اور وزن کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔)

اصول مذکورہ کی تعلیل | اگر تم رقاص کی آمد و رفت پر غور کروگے تو معلوم ہوگا کہ یہ حرکت دو مختلف قوتوں کا نتیجہ ہے، ایک وہ قوت ہے جس نے رقاص کو ابتدا میں حرکت دی تھی، جسے ہم قوتِ دافعہ سے تعبیر کرتے ہیں، یہ دافعہ قوت اگرچہ ہر مرتبہ رقاص کو ڈھکیلتی رہتی ہے مگر اس کے ساتھ لازم نہیں ہے، یعنی اس میں تجدد ہے استمرار نہیں ہے (ہر دفعہ نئی پیدا ہوتی ہے)۔

دوسری قوت زمین کی جاذبیت ہے، جو ہر وقت رقاص کے ساتھ لازم ہے، لیکن جب رقاص خطِ سمتی سے دور ہوتا ہے تو یہ قوت ضعیف ہوتی ہے اور جب قریب ہوتا ہے تو قوی ہو جاتی ہے (خطِ سمتی وہ عمودی خط ہے جو رقاص کے نقطۂ تعلیق سے مرکزِ ارض کی طرف جاتا ہوا فرض کیا جائے۔)

جس طرح رقاص کی حرکت دو قوتوں کے فعل سے پیدا ہوتی ہے اسی طرح کپکپاتے ہوئے تار کی حرکت بھی دو مختلف قوتوں کا نتیجہ ہے؛ ایک وہ قوت ہے جو تار کو جنبش دیتی ہے مگر اس،

کے ساتھ لازم نہیں رہتی اور دوسری تار کی [illegible] سے ہر وقت خطِ مستقیم پر رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور یہ قوت تار میں دائمی [illegible]

لچکتی ہوئی شاخ اور پانی کا تموج بھی دو قوتوں کا [illegible] مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ہر حرکتِ دوری کم از کم دو قوتوں کا نتیجہ ہوتی ہے مگر ایک قوت دوسری سے متفاوت ہوتی ہے۔

حرکتِ دوری کے متعلق سپنسر کی توجیہ | حرکتِ دوری وہاں پائی جاتی ہے جہاں مختلف اور غیر متوازن قوتیں متصادم ہوں۔ اگر متصادم قوتیں متوازن ہیں تو نتیجہ سکون کی صورت میں نمایاں ہوگا، اور اگر ایک قوت دوسری سے زیادہ ہوگی تو حرکت بھی اسی جہت میں ہوگی۔ استمرارِ حرکت جبکہ وہ ایک اندازہ اور ایک صفت پر ہو، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ جسمِ متحرک مختلف حرکت دینے والی قوتوں کے باوجود بالاستمرار اپنی جگہوں کو چھوڑتا جائے اور یہ بالکل محال ہے کیونکہ جب جسم منتقل ہو کر ایک مکان سے دوسرے مکان میں پہونچا ہے، تو لامحالہ اس پر اثر ڈالنے والی قوتوں کی نسبت میں فرق پڑتا ہے۔ یا یوں سمجھنا چاہیئے کہ انتقالِ مکانی سے ایک قوت اپنے اثر میں دوسری پر غالب آجاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک اندازہ اور ایک نسبت سے حرکت باقی نہیں رہتی۔ لہذا ایک اندازہ اور ایک کیفیت کے ساتھ متحرک ہونے کے لئے غیر متناہی زمان و مکان کا ہونا ضروری ہے؛ اور یہ ایک ایسا نتیجہ ہے جس کو عقل تصور میں نہیں لاسکتی۔ اس لئے اس استمرار کے قائم رکھنے کے لئے صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ کہ حرکت دوری ہو، چاہے وہ حرکت ایک متعین قوس پر ہو جیسے رقاص کی حرکت، یا دائرہ پر ہو، جیسے زمین کی حرکت آفتاب کے گرد۔

تطبیق | اس دقیق تعلیل کو سمجھنے کے لئے ہم حرکتِ رقاص کی توضیح کر کے اس پر منطبق کرتے ہیں:-

اگر تم رقاص کو ایک معین طاقت سے دفع کرو تو وہ اپنے خطِ سمتی سے ایک قوس پر حرکت کرتا ہوا علیحدہ ہوگا۔ اور اس قوس کا تحدّب مرکزِ زمین کی طرف ہوگا، مگر زمین کی قوتِ جاذبہ اس حرکتِ اندفاعی کا مقابلہ کرتی رہے گی، اور اس کوشش میں ہوگی کہ اس کو اپنی جگہ پر واپس کر دے۔

چونکہ قوتِ دافعہ، جس نے رقاص کو ڈھکیلا تھا، اس کے ساتھ لازم نہیں ہے، اس لئے جس قدر وقت صرف ہوتا جائے گا اس کی تاثیر ضعیف ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ آخر میں زمین کی جاذبہ قوت اس پر غالب آکر اُسے واپس کر دے گی۔ واپسی کے وقت رقاص جس قدر خطِ سمتی سے قریب ہوگا،

اسی قدر اس کی حرکت تیز ہوتی جا [illegible] جس طرح کہ زمین پر گرتا ہوا پتھر جوں جوں زمین کے قریب ہوتا جاتا ہے اس کی حرکت [illegible] جاتی ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ رقاص جس قدر [illegible] قریب ہوتا جائے گا، اس کی حرکت تیز ہوتی جائے گی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ رقاص جس قدر خطِ سمتی سے قریب ہوتا جاتا ہے، اس میں ایک جدید قوت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے جب رقاص، خطِ سمتی تک پہونچ جائے گا، تو وہاں ساکن نہ ہوگا، بلکہ اس کو تجاوز کر کے آگے بڑھتا ہوا چلا جائے گا؛ کیونکہ جب وہ خطِ سمتی تک پہونچا تھا تو اگرچہ جذبِ زمین کی قوت اپنا کام ختم کر چکی تھی، مگر اس جدید قوت کا عمل ابھی باقی تھا جو خطِ سمتی کی طرف آتے وقت رقاص میں پیدا ہو گئی تھی، لہٰذا وہ رقاص کو کھینچے ہوئے خطِ سمتی سے آگے لے گیا؛ لیکن اب جس قدر وہ خطِ سمتی سے دور ہوتا جائے گا، جاذبیت زمین کا اثر اس پر زیادہ ہوتا جائے گا اور دافعہ قوت جس کی وجہ سے وہ جاذبیت کے خلاف جا رہا تھا ضعیف ہوتی جائے گی (ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ اوپر کو پھینکتے ہوئے پتھر کی حالت ہوتی ہے) اور آخر کار جاذبیت ارضی اس پر غالب آکر اس کو پھر خطِ سمتی پر لانا شروع کرے گی۔ پھر اس حرکت میں علاوہ جاذبیت کے ایک نئی قوت اندفاعی پیدا ہو جائے گی، مگر پہلی سے کم اور وہ اُسے خطِ سمتی سے آگے لے جائے گی۔ غرض اسی طرح رقاص آتا جاتا رہے گا، یہاں تک کہ قوتِ اندفاعی بالکل مفقود ہو جائے اور جاذبیت ارضی اس کو خطِ سمتی پر ساکن کر دے۔

اگر تم تار کے تناؤ کی جاذبیت زمین کی جگہ فرض کرو تو اس کے اہتزازات کی بھی یہی توجیہ کر سکتے ہو۔

حرکتِ دوری غیر تام ہوتی ہے

اسپنسر کہتا ہے کہ حرکتِ دوری کی آمد و رفت، اُس وقت خطِ مستقیم پر ہو سکتی ہے، جبکہ دو متضاد قوتیں زاویہ مستقیم پیدا کریں۔ اور ان دونوں کی ایک معین نسبت ہو؛ لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے مختلف قوتوں کے عمل اور اُن کی مختلف نسبتوں سے بیضوی دائرے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب دو سے زیادہ مختلف قوتیں اثر کرتی ہیں تو ہر پچھلا دورہ اس خط پر نہیں ہوتا جس پر اگلا دورہ ہوتا ہے، بلکہ ہر مرتبہ اس کا مدار تنگ ہوتا جاتا ہے؛ چنانچہ یہی سبب ہے کہ اجرامِ فلکی جاذبہ اور دافعہ کے باہمی تفاعل سے اپنے ہر دورہ میں مرکز کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہوتا ... عناصر یا ایتھر میں حرکت کرتے رہتے ہیں اور ان کے دورے ہوتے ہیں۔ ا... کو تموجی اور اہتزازی کہہ سکتے ہیں اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہوگیا ہوگا کہ یہ تمام ... ہر ہیں جو ہر جگہ مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہے۔

افکار وحشت

زہے بے وفایاں اس قدر کھانے کی عادت ہے
کہ چشم بے مروت سے تجھے چشم مروت ہے

امیدوں کی فراوانی تمناؤں کی کثرت ہے
دل شیدا الٰہی ناواقف انجام الفت ہے

عجب کیا ہے جو میری بات رکھ لے شان غفاری
کہ عذر معصیت پروردہ اشک ندامت ہے

نہیں دیکھی کسی نے اضطراب دل کی رسوائی
سکون کشتگان یاس پر الزام راحت ہے!

برابر سے چلی جاتی ہے حسن و عشق کی چشمک
جواب جلوۂ آئینہ رویاں میری حیرت ہے

خدا جانے دل ناکام کا افسانہ کیا ہوگا
جہاں لاکھ آرزوئیں تھیں وہاں اک داغ حسرت ہے

نظر انجام پر اے عقل کب تک شغل الفت میں
ترے آئین خودداری سے خود وحشت کو وحشت ہے

بیاض نیاز

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ ختم ہوئی بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

آرزو دل میں ہے اک شخص سے ملنے کی بہت ـ اکبر ـ نام کیا لوں کوئی اللہ کا بندہ ہوگا
بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ ـ حالی ـ اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

کون پرساں ہے حال بسمل کا ـ بیمار ـ خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

جاپا[illegible] پر اک نظر

تمہید | جاپان کی قدیم ضرب المثل ہے کہ "قلب صادق کی حفاظت ایک دیوتا کے سپرد ہے، اگرچہ اس قلب سے کوئی دعا رنہ نکلتی ہو" یہی حالت جاپانی شاعری کی ہے۔ وہ الفاظ، بحور اور قوافی سے بالکل مستغنی ہے اور اس کی بنیاد صرف "سکوت" اور "خواب" پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض وقت وہ بظاہر بے معنی معلوم ہوتی ہے اور الفاظ شعری سے گذر کر یا تو وہ اس قدر عمیق ہو جاتی ہے یا اس قدر ہلکی ہو جاتی ہے کہ جب تک سامع کے دل پر ایک خاص کیفیت یا اثر نہ ہو وہ اس کے سمجھنے سے عاری رہتا ہے۔

اس میں دل کے معاملات اور عشق کے اندوہناک واقعات، وصل و جدائی کی کیفیات اور چاند تاروں اور پھولوں کی نغمہ سرائی غرض سب کچھ موجود ہے، لیکن جاپانی عقیدہ یہ ہے کہ بہترین اشعار وہ ہیں جو ضبطِ تحریر میں نہ آسکیں اور ان کا نغمہ کبھی شرمندۂ ساز نہ ہو۔ بلکہ پردۂ سکوت میں ترنم ریزیاں کرتا رہے۔ جاپانی شاعری میں بہترین اشعار وہ مانے جاتے ہیں جو قدرت کے کسی ایک موقع یا زندگی کے کسی واحد لمحہ پر تصویر یا کیفیت کی تیز شعاع چشم زدن کے لئے ڈالتے ہیں اور کسی بھولی ہوئی، یا پسِ پردہ شے کی جھلک دکھا کر دلوں کو زخمی یا مسرور کر دیتے ہیں۔

تاریخ | جاپانی شاعری کب سے شروع ہوئی، اس کا تاریخی ثبوت کوئی موجود نہیں ہے، سینکڑوں برس کے پرانے اشعار موجود ہیں، لیکن ان سے پہلے بھی جاپان میں شاعری ہوتی تھی، شاعری کی قدامت اس درجہ پر ہے کہ بعض محققین ہزارہا برس پہلے شاعری کے وجود کو مانتے ہیں اور اس طرح پر ایک طریقہ سے اُن جاپانیوں سے متفق ہیں جو اپنی شاعری کی ابتدا اور دیوتاؤں سے منسوب کرتے ہیں۔ بہرکیف جب سے جاپانی تاریخ کا پتہ چلتا ہے، دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ شاعری جاپان میں موجود تھی اور دوسرے یہ کہ جاپانی حکومت و معاشرت میں شاعر کو امتیازی رتبہ حاصل تھا چنانچہ صدہا روایتیں اور بیانات اس واقعہ کی تائید میں موجود ہیں۔ ہمارا مقصد صرف جاپان کی قدیم شاعری پر ایک نظر ڈالنا ہے کیونکہ جاپان پر موقوف نہیں ہے، بلکہ تمام دنیا سے دورِ شاعری

اُٹھ چکا ہے اور کیا ہندوستان، کیا جاپان، [illegible] اعری دُنیا سے اُٹھ گئی اور اب سوائے پُرانے شعراء کے کلام کے شا[illegible] ں ہے، اور نہ اِس دورِ مادہ پرستی میں شاعری کا جادو کسی پر چل سکتا ہے [illegible]

بہرکیف جاپان کی بہترین شاعری کا زمانہ وہ تھا۔ جبکہ وہا[illegible] کے لوگ فنِ تحریر سے واقف نہ تھے اور شاعری کو ایک مستقل فن تصور کرتے ہوئے اسی فن میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ایشیاء کے دیگر ممالک کی طرح جاپان میں بھی استادی، شاگردی کا سلسلہ جاری تھا اور وہاں بھی مشہور استادوں اور شاگردوں کے درمیان شاعری کا نسب نامہ پایا جاتا تھا۔ لیکن یہ بات البتہ مجھکو جاپانی شعراء میں نئی ملی کہ وہ اپنے فن میں اس درجہ مستغرق رہتے تھے کہ نام و نمود، جاہ و ثروت، دولت و امارت شاعری کے منافی خیال کی جاتی تھی اور بالعموم تمام مشہور شعراء سخت غربت اور عسرت کی زندگی بسر کرنا اپنے فرض سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں بھی ایسی مثالیں ضرور موجود ہیں اور میرے خیال میں دیگر ممالک بھی ایسی روشن مثالیں ضرور پیش کریں گے، تاہم جاپان میں یہ بات ضروری ہے کہ وہاں شاعری اور افلاس کا اجتماع بالکل لازمی قرار دیا گیا تھا اور اس پر سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی تھی۔ چنانچہ مشہور شاعر باشو متوسو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی پچاس سالہ شاعرانہ زندگی نہایت درجہ افلاس کی حالت میں گذری اور یہی مفلسی اس کی اخلاقی طاقت اور دماغی یکسوئی کا باعث ہوئی۔ کسی موقع پر اس کے شاگردوں نے قریب پچاس روپیہ کے اس کو بطور زادِ راہ دینا چاہا لیکن اس نے باوجود زمانہ قدیم کی سفر کی صعوبتوں کے اس بناء پر روپیہ لینے سے انکار کر دیا کہ ممکن ہے یہ نئی دولت چوروں کو میری طرف رجوع کرے اور میرے خیالات کے انتشار کا باعث ہو جائے۔

کہا جاتا ہے کہ جاپانی شعراء، حصولِ فن میں بڑی محنت کرتے تھے اور اسی سبب سے زندگی بھر میں صرف تھوڑے سے اشعار کہہ سکتے تھے، اسی باعث آج یہ مشکل تمام جاپانی شاعری میں چند سو یا قریب ایک ہزار اشعار چوٹی کے مانے جاتے ہیں۔ اس واقعہ پر ممکن ہے کہ بعض لوگ جاپانی شاعری کو کم وقعت خیال کریں، لیکن اگر وہ غور کریں، تو معلوم ہوگا کہ غالب سے پہلوانِ سخن، نظرت شناس، استادِ زبان، عالمِ بے مثال، شاعرِ نازک خیال، کہنہ مشق اپنے دیوانِ اُردو کے انتخاب پر مجبور رہا۔ لیکن اس کا بھی یہ حال ہے کہ کوئی صحیح المذاق شخص انکار نہیں کرسکتا کہ اس انتخاب

میں بھی رطب و یابس موجود ... انتخاب مزید کا محتاج ہے۔ اسی طرح اس خدائے سخن، پیغمبر عشق، شہید ف... ن دیکھو بعض جگہ سر کو دیوار سے پھوڑو گے تو کہیں بلا کسی تاثر کے صفحے کے صفحے اُ... جاوے۔

اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر میر انیس کے مراثی پر نظر ڈالو گے تو (عقاید سے برطرف) محض شاعری میں میرو مرزا کی ٹکر کا اُستاد ثابت ہوتا ہے تاہم (میں پھر معافی چاہ کر عرض کرتا ہوں کہ مذہبی عقائد کے معاملات سے علیحدہ ہوکر) اگر صرف شاعری کی حیثیت سے اُن کے مراثی کا انتخاب اس خیال سے کیا جاوے کہ وہ اشعار جو بے نظیر ہوں صرف انتخاب میں لائے جائیں تو کس قدر اشعار منتخب ہو سکیں گے۔ مکرر اور سہ کرر غور کے بعد احباب سلیم الطبع جو جواب دیں گے اس سے اُردو کی دُنیا ادب میں ایک تلاطم برپا ہو جائے گا۔ ایک جاپانی محقق یورپ کو مخاطب کر کے کہتا ہے "شاعروں کو چاہیئے کہ اپنے کلام کی اشاعت سے بے نیاز ہو کر قدیم شعراء جاپان کی طرح اپنی زندگی فن شعر میں بسر کر دیں، کیونکہ شاعر کے لئے شعریت میں زندگی بسر کرنا دُنیا کی اول اور آخیر خوشی و نعمت ہو سکتی ہے، شاعری اور زندگی کی مواصلت اور یکجائی صرف عملاً اور فعلاً ہی ممکن ہے نہ کہ مطابع کے ذرائع سے کلام کی اشاعت سے۔ میں نے اکثر شعراء دیکھے ہیں جو اپنے دیوان کی جلدوں میں زندہ رہے اور جب اوراق کی سیاہی زائل ہو گئی وہ بھی دُنیا سے مٹ گئے"۔

مذکورۂ بالا طعن آمیز الفاظ پر اگر دُنیا کاربند ہوتی تو آج صرف چند ہزار اشعار ہوتے، یا ممکن ہے لاکھ دو لاکھ تک تعداد پہنچ جاتی، لیکن مذاق شعری دُنیا کا آج کس قدر صحیح ہوتا اور شاعری آج تک روحانی و اخلاقی ترقی میں ایک عالمگیر اثر ڈالنے والی نعمت خیال کی جاتی۔

جاپانی شاعری | میں اپنی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں (اگرچہ میری معلومات بجائے خود نہایت محدود ہیں) کہ جاپانی شاعری فی نفسہ، اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، بھاشا وغیرہ کی شاعری سے مختلف نہیں ہے، میں ہمیشہ سے اس بات کا قائل رہا ہوں اور میرے محدود علم و تجربہ اور سیاحت نے میرے خیال کو مستحکم کر دیا ہے کہ دُنیا میں ہر زبان اور قوم کی اصل شاعری ایک ہے، تراکیب و اسالیب، واقعات و مشاہدات، رسوم و رواج، انداز بیان و زبان کی خصوصیات و نیز مذاق ملکی و قومی کی بنا پر جو بظاہر اختلاف نظر آتا ہے وہ بہت کچھ ناتجربہ کاری اور کوتہ نظری کی وجہ سے ہے، ورنہ کیفیات

قلب، حضرت آدم کے وقت سے اب تک د[illegible] ہانیاں ہزاروں شعرار سُنا گئے اور ہر ملک میں ان کو مختلف پیرایوں میں [illegible] ہی ایک رہا، عاشقی میں اگر ہجر کا سامنا تھا تو دل کی بے قراری ہر شاعری میں موجود ہے [illegible] اٹکا تھا تو خیالات میں بھی ہر شکل میں نمایاں ہے اسی طرح مواصلت میں جو خوشی ہوتی ہے وہ انگلستان کے شعرار سے لیکر عرب کے بدوؤں تک نے ہمیشہ محسوس کی، اور نیپال و افریقہ میں بھی اس کے گیت ہنوز گائے جاتے ہیں۔ اسی طرح مناظر قدرت و دیگر کیفیات قلب دُنیا کی شاعری میں موجود ہیں، غرضکہ یہی حال جاپانی شاعری کا بھی ہے۔

پھر بھی جاپانی نقطۂ نظر سے "شاعری بیکار حیثیت میں کار آمد چیز ہے" اور اس کی مثال یوں دی گئی ہے کہ "آبشار میں پتھر کے ٹکڑے کو دیکھو، فی نفسہ وہ بالکل مبتذل ہے، لیکن یہ خیال آتے ہی کہ آبشار کا ترنم صرف اس ذلیل سنگ پارہ سے مس ہونے پر منحصر ہے، اس سنگ ریزہ کی ذلت فنا محو ہو جاتی ہے اور وہ ایک کار آمد و مفید شئے معلوم ہونے لگتا ہے" اسی طرح الفاظ، جاپانی شاعری میں سنگریزہ ہیں، لیکن چونکہ شاعری کا ترنم الفاظ پر منحصر ہے، اس لئے وہ الفاظ جن کا مجموعہ شعر ہے قابل قدر چیز ثابت ہوتے ہیں۔

بالشو مٹسو شاعر کے ایک شاگرد ہوکوشی کا واقعہ ہے کہ جب اُس نے اپنے مکان کی آتش زدگی کے موقع پر یہ نظم جو جاپانی شاعری میں صنعت ہکو کہی جاتی ہے نظم کی۔

"وہ (یعنی میرا مکان) جل کر خاک میں مل گیا
پھولوں کے گرنے میں کس قدر اطمینان مسرت ہوتی ہے"

تو، اس نظم کو سُن کر اُستاد شفیق نے کہا کہ "زمانہ قدیم میں جاپان میں ایک شاعر تھا، جس نے اپنے شعر کی خوبی سے متاثر ہو کر اپنی جان دیدی تھی، جب تم ایسی نظم کہہ سکتے ہو تو مجھے یقین ہے کہ مکان کے جل جانے کا تم کو غم نہ ہوگا"

اور واقعہ یہ بھی یہ ہے کہ کسی کا دل اگر اپنے مکان کے خاکستری کے موقع پر آگ کی چنگاریوں کو پھولوں سے تشبیہ دے، تو حقیقتاً وہ شخص اپنی زندگی شعر میں بسر کرتا ہے۔ غرض اس مثال سے یہ تھی کہ بظاہر اندازِ بیان نے اس جاپانی شعر کو ہندوستانی مذاق سے جدا کر دیا ہے لیکن اپنی خانہ بربادی

پر مسرور ہونے کا مضمون ہمارے [illegible]
ایک جاپانی شاعر (۵۷ [illegible] ہے:-

"حیف - میرا رازِ محبت آشکارا ہو گیا
میں سوچا کرتا تھا کہ یہ معاملہ کسی پر ظاہر نہ ہو سکے گا"
"حیف - میری صورت نے میرا رازِ الفت افشا کر دیا
لوگ متحیر ہو کر پوچھا کرتے تھے کہ تو اداس کیوں رہا کرتا ہے"

ان ہر دو نظموں کے مضمون مختلف طور پر ہمارے شعرا کے دیوانوں میں بھرے ہوئے ہیں۔
ایک اور جاپانی نظم لیجئے:-

"چاند میں یہ قدرت نہیں ہے کہ مجھ پر سکوت کا عالم طاری کر دے اور میری آنکھوں سے آنسو نہ نکلیں، مگر افسوس ہے کہ میرے آنسو (نہ معلوم کیوں) غم کناں خود بخود نکلے پڑتے ہیں"

یا اس نظم کو دیکھئے۔

"طوفانِ برفباری میں جو پھول (بسرعت) گر رہے ہیں یہ فی الحقیقت پھولوں کا گرنا نہیں ہے بلکہ میری زندگی کے لمحے مجھ سے جدا ہو رہے ہیں۔ اور میری زندگی کم ہوتی جاتی ہے"

یہ مضمون میر صاحب انیس اعلی اللہ مقامہ کے شعر سے ملتا جلتا ہے۔

خود نویدِ زندگی لائی قضا میرے لئے ۔۔۔ شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے

چونکہ سلسلۂ مثال شروع ہو گیا ہے لہٰذا دو نظمیں اور درج کروں گا جو بذاتہ اپنی لطافت میں دنیا کے ہر لٹریچر کے لئے مایۂ ناز ہو سکتی ہیں۔

"آج بہار کا دن ہے، آسمان برس کر کھل گیا ہے اور آفتاب کی روشنی دور تک پھیل رہی ہے
لیکن پھول کیوں افسردہ ہیں اور کیوں شاخ سے جدا ہو رہے ہیں"

مندرجہ ذیل نظم مسلسل ہے۔ اس موقعہ پر مجھ کو سر ولیم جونز (Sir William Jones) کا عبرانی شاعری کے متعلق مقولہ یاد آ گیا اگر میرا حافظہ میرا ساتھ دیتا ہے تو وہ عبرانی شاعری کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ "عبرانی شاعری کی مثال اس درخت کے تنے کی ہے جو سنسان ویرانہ میں کھڑا ہوا ہے اور اس میں آگ لگ گئی ہے اور وہ تنہا کھڑا ہوا جل رہا ہے"۔

دیکھو ایک مہجور و مایوس دل شکستہ، متاع [illegible] ے الم کی حالت میں (غالباً ویرانہ میں) مثل درخت کے تنے کے کھڑا ہوا آتش [illegible] ہے اور اس عالم بیاباں میں ایک سنگ پارہ کو اُٹھا کر بے اختیار کہتا ہے۔

"میں اس پتھر کے ٹکڑے کو اُٹھاتا ہوں جس میں کوئی آواز نہیں ہے اور اپنی دُنیا کو آنسوؤں سے شرابور کر دیتا ہوں۔

"یہ خیال غلط ہے کہ محبت کی وجہ سے میری یہ حالت ہوگئی ہے مجھے درد دل کی تکلیف نہیں ہے، جس کے باعث میں اس قدر بے چین ہوں میری حالت محبت اور درد دونوں کی حد سے گذر چکی ہے۔ جب تنہائی کا سناٹا میرے سینہ میں سماجاتا ہے تو آتش دروں سے میرے خیالات کا گوشت جلنے لگتا ہے اور میری آنکھوں سے گرم آنسو بے اختیار بہ نکلتے ہیں۔"

"اُس وقت مجھ میں نہ خدا ہوتا ہے اور نہ موت ہوتی ہے
مجھ پر صرف تنہائی کے سناٹے کا قبضہ ہوتا ہے
اب میں اپنی زندگی کے ہاتھوں خود شکار ہوں۔
اور اس دُنیائے ناپیداکنار کو اس خاموش پتھر کی ہمنوائی میں روکر ہبلا رہا ہوں
میری حالت جوں جوں خراب ہوتی ہے اس سنگ پارہ کی خموشی بڑھتی جاتی ہے
اور میں اسی طرح اس کو اپنے آنسوؤں سے ترکیا کرتا ہوں۔"

میں اس سلسلہ کو قایم رکھتا لیکن مقصدِ مضمون فوت ہو جائے گا اور جو سرخی میرے مضمون کی ہے اس سے جدا ہو جاؤنگا، اس لئے صرف اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جاپانی شاعری بھی مختلف اصناف پر منقسم ہے، چونکہ ہر صنف پر لکھنے کے لئے کئی رسالوں کا حجم درکار ہے اس لئے جو بالکل نئی اور تعجب خیز صنف ہے اس کا کچھ ذکر کرتا ہوں، اس کو "ھکو" کہتے ہیں، ھکو نظم میں سترہ ٹکڑے ہوتے ہیں اور اپنے اختصار کے باعث نہایت عجیب صنعت ہے۔ نظم میں بہ مشکل چند الفاظ ہوتے ہیں، لیکن ہر لفظ ایسے موقع اور محل سے رکھا جاتا ہے کہ اشاروں اور کنایوں

سے بڑے سے بڑا مضمون پیدا کر ... وں کا دل آویز مجموعہ، جاپان میں نہایت قدیم اور مقبول ہے، مجموعہ کیا ہوتا ہے ... پھولوں کی پتیوں سے ایک گلدستہ بنایا جاتا ہے، جس کی مجموعی خوشبو اور ایک ایک پنکھڑی کی جداگانہ خوشبو دماغ میں مختلف اقسام کے پھولوں کا تختہ پیدا کر دیتی ہے۔ اس صنعت میں جو نظم ہوتی ہے وہ اپنے نزاکت الفاظ و سبک بیانی کے باعث بجائے خود کچھ حقیقت نہیں رکھتی، لیکن اس میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ دلوں پر ہلکا سا نشتر لگا کر خیالات کو کسی بھولی ہوئی چیز، دور از یاد صحبت، یا نظروں سے اوجھل منظر کی برق وش یاد دلا کر طبیعت کو بے چین کر دیتی ہے، اور یہی مآل شاعری ہے، مندرجہ ذیل نظم ھکو ہے۔

"کنداچی نی
کستو نے باکے تاری

یوئی نو ہارو"

اس نظم کو پڑھو اس کو سترہ ٹکڑوں میں بآسانی تقسیم کر سکو گے، اس صنعت کا مالک باشو نامی شاعر ہے جو سترہویں صدی میں زندہ تھا، اس نے اپنی تمام عمر سیاحی میں گذاری، بستر مرگ پر پڑا ہوا یہ نظم کہتا ہے۔

"سفر میں بیمار پڑا ہوں
مگر میرے خیالات وطن کے ویران کھیتوں میں بکھر رہے ہیں"

بوسن شاعر کہتا ہے اور کس قدر سچ کہتا ہے انداز بیاں دیکھو:۔

"بمشکل جو دن کٹتے تھے جمع ہوئے اور جمع ہو کر حیف ہے کہ بہت جلد گذر گئے"۔

ناظرین نے اب سمجھ لیا ہوگا کہ ھکو شاعری فی الواقع کسی شے یا کسی واقعہ کی تصویر نہیں کھینچتی ہے اور نہ کوئی خاص لفظی خوبی ہوتی ہے، وہ صرف شاعر کے خیال یا جذبہ کی ایک جھلک دکھاتی ہے اور مختلف طبائع مختلف طریقہ پر لطف اندوز ہوتے ہیں، یعنی نظم محض ایک خاکہ یا فریم ہے اور اس کو پڑھنے والا اپنے حوصلہ اور خیال کے مطابق اس میں رنگ بھر کر تصویر طیار کر لیتا ہے۔

ایک جاپانی شاعر کہتا ہے۔

"پورانا تالاب
اس میں مینڈک کودا
ذرا پانی کی آواز سنو"!

سچ یہ ہے کہ حضرت غوک جس طرح آپ کے ملک میں بدنام ہیں اس طرح جاپان میں ذلیل و رسوا نہیں ہیں۔ وہاں اُن کی طرح طرح سے خاطر و مدارات ہوتی ہے اور جس طرح یہاں بعض گھروں میں جوڑے پالے جاتے ہیں، اسی طرح ان جناب کی بھی جاپان میں پرورش کی جاتی ہے اور نہایت ذوق سے آپ کو دستر خوان کی زینت کا فخر دیا جاتا ہے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، تنہائی میں مینڈک کا تالاب میں کودنا آواز پیدا کر کے سکوت کو شکست کر دیتا ہے اور دُور سے یہ آواز بھلی معلوم ہوتی ہے اور اس نظم سے جاپان کے موسم زمستان کا پتہ چلتا ہے۔ جاپان میں اس نظم کو تقدس کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، کیونکہ کہا جاتا ہے کہ نظم کے بعد شاعر کو اپنی شاعری کا اندازہ ہو گیا اور پھر تمام عمر اسی طریق کی شاعری کا پابند رہا۔ الغرض رفع غلط فہمی یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ شاعر نے تمام عمر حضرت غوک کی شان میں قصائد نہیں لکھے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس نے تمام عمر اشارے اور کنائے کی شاعری کی۔)

"کس قدر فرحناک وہ گھنٹی کی آواز ہے
جو گھنٹی سے بھی جدا ہو جاتی ہے"

جو لوگ دور سے گھنٹہ کی آواز سُن کر فرق بتا سکتے ہیں کہ یہ شب کے وقت، یا دن کے وقت کی آواز ہے وہ با آسانی اس نظم کو سمجھ سکیں گے، شاعری کا مطلب یہ ہے کہ موسم بہار میں طلوع آفتاب سے قبل جبکہ ہر شے پر سکون طاری ہے شاعر دور سے گھنٹہ کی آواز سُن رہا ہے اور اس آواز کو فرحناک بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ آواز گھنٹہ سے بھی جدا ہو جاتی ہے، رات اور دن کے گھنٹے کی آواز میں یہی فرق ہے۔ غرض اس نظم میں شاعر اس لطف کو یاد دلاتا ہے۔

"موسم بہار کی رات
اف شام اور صبح صادق کا وہ درمیانی عرصہ"

ھکو شاعر بہتے پانی کی طرح ہے جس میں تم کو خود تمہارا عکس نظر آ رہا ہے، اسی وجہ سے وہ ترجمہ سے

بے نیاز ہے اور اس کا ترجمہ تقریباً نا[illegible] جاپانی نقاد اس صنعت کے متعلق کہتا ہے کہ ہکو شاعری شبنم کے قطرہ کی طرح کنول کے سبز پتوں یا بیل کے سرخ پتوں پر چمکتی ہے، شبنم کا وجود کچھ حیثیت نہیں رکھتا ہے، لیکن آفتاب کی شعاعوں، اور حرکت کے باعث، کبھی ارغوانی کبھی نیلمی اور کبھی سچے موتی کے رنگ میں چمکتا ہے۔

یا بالفاظ دیگر ہکو شاعری اس خانہ عنکبوت کی مانند ہے جس پر بے شمار قطرے شبنم کے لدے ہوئے ہیں اور وہ دو شاخوں پر تنا ہوا پتوں کے سایہ میں ہلکے ہلکے جھکولے لے رہا ہے، مکڑی کا جالا کچھ حقیقت نہیں رکھتا ہے لیکن اس کے حرکت اور جنبش کی ناقابل بیان خوبی اس لطف کو ظاہر کرتی ہے جو اس صنعت شاعری سے متعلق ہے۔

کاگا کی مشہور شاعرہ جی یو اپنے لڑکے موت پر مرثیہ لکھتی ہے۔

"بھونرے کے پیچھے بھاگتا ہوا
وہ آج کتنی دور نکل گیا ہے (کہ اب تک نہیں لوٹا)"

بچہ کا بھونرے کے پیچھے بھاگنا اور بھاگتے ہوئے ماں کی نظروں سے اوجھل ہو کر دور نکل جانا اور پھر ماں کا انتظار، کیسے لطیف کنائے ہیں، اور جب یہ شعر ماں کی زبان سے بچہ کی موت کے موقع پر ادا ہو تو کس قدر دلگداز دلدوز اور دل بھر لانے والا کنایہ ہے۔ غالباً ماں کی زبان سے اس سے بہتر معصومانہ اور منتظرانہ اشعار دنیا کا کوئی لٹریچر پیش نہ کر سکے۔ اس وقت مجھے سیفو یونان کی آتشی شاعرہ کا ایک شعر شام کی تعریف میں یاد آگیا جس کا مطلب یہ ہے۔

"شام جو بھیڑوں کے گلہ کو چراگاہ سے واپس بھیجتی ہے اور بچھڑے ہوئے بچے کو اس کی ماں سے ملا دیتی ہے"

صدہا شعراء کے دیوان اس شعر پر قربان ہیں، افسوس کہ اس شاعرہ کا کلام کبھی محفوظ نہ رہ سکا، اس وقت یورپ میں اس کے صرف یک صد اشعار و مصرعے اور مصرعوں کے اجزاء موجود ہیں اور جو کچھ محفوظ ہیں غیر فانی ہیں، اور کسی قوم اور کسی لٹریچر کے مقابلہ میں نہایت آب و تاب کے ساتھ پیش کئے جا سکتے ہیں اگر فرصت ملی تو سیفو پر بھی کبھی لکھوں گا۔ اس کے حالات زندگی مختصر ہیں، مگر عشق و شاعری کی جو مثال وہ پیش کرتی ہے، اس کی شان کچھ اور ہے۔

جعفری

رباب شک

سن، اے برہم زنِ جمعیتِ جذباتِ پنہانی
تری غفلت سے قائم تھا مرا آرامِ روحانی

نہ کچھ غم تھا، نہ کچھ نیشِ الم سے جان کو مطلب تھا
نہ دل محزوں، نہ آنکھیں واقفِ خونابہ افشانی

مسرت پرورش پاتی تھی، آغوشِ تصور میں
نہ تھی ارماں کی کشتی، بحرِ ناکامی میں طوفانی

مری ہستی پہ وہ کیفِ تبسم ریز طاری تھا
کہ جس سے بہرہ ور تھا خندۂ گلہائے بستانی

یہ عالم تھا کہ دل میں اک تمنا سی ہوئی پیدا
صلائے بیخودی تھی شوقِ عشرت کی فراوانی

نمودِ آرزو نے اک خلش جب دل میں پیدا کی
تو اس کا اقتضا تھا تیرے کاشانہ کی دربانی

حریفِ شورشِ دردِ محبت بن گئی آخر
تپش آمادگی دل کی، جگر کی شعلہ سامانی

وفورِ شوق میں بیتابیوں کا اب تقاضہ تھا
کہ زائل ہو مرے غمخانۂ عزلت کی ویرانی

ترے جلووں سے خلوت کا یہ عالم ہو کہ شرمائے
فروغِ غازۂ رو سے رخِ شمعِ شبستانی

نویدِ کامرانی محفلِ عشرت کا آئین ہو
نہ رہ جائے امنگوں کو تمنائے شبِ ثانی

مئے تندِ جوانی، اُف، جو چھلکے تیری آنکھوں سے
تو اس کا نشہ دہو دے، دل سے فرقت کی پریشانی

غضب تھا، دل کے ایسے رازِ سربستہ کا کھل جانا
پیامِ صد بلا تھی، جوششِ الفت کی نادانی

تری خود بینیوں نے تجھکو دیکر درسِ بیزاری
تماشہ گاہ کردی، میرے دردِ دل کی عریانی

کوئی بتلائے کیونکر محو کردوں، عہدِ ماضی سے
وہ لمحہ جس میں تو نے دل کی دکھتی چوٹ پہچانی

قیامت تھی، ترے پندارِ خوابیدہ کی بیداری
تو اب اک ملکۂ برہم تھی اور میں ایک زندانی

سرورِ فتحمندی میں وہ تیری ناز فرمائی
شکستِ جاں گسل ہیں، وہ مری گم گشتہ درمانی

اسی کا نام بختِ نارسا کی واژگونی ہے
کہ اسبابِ تبسم سے ہو پیدا، وجہِ گریانی

تری برگشتگی تو اک فریبِ دارِ امکاں تھی
نہ آیا راس مجھ کم بخت کو ذوقِ تن آسانی

خوشا وہ جس کی مرگِ ناگہاں نے مشکل آساں کی
مگر مجھکو تو مرنے بھی نہیں دیتی گراں جانی

تمنا کی تو راتیں، خیر، جوں توں کٹ گئیں لیکن
یہ بتلا کیسے کاٹوں، یاس کے ایامِ طولانی

مخمور

مادیین کا مذہب

(۳)

حیات

اگر کائنات کی تمام مختلف الاشکال اور مختلف الطبائع اشیار کی تقسیم کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ عالم جماد سے متعلق ہیں یا عالم حیات سے (جس میں نباتات وحیوانات بھی شامل ہیں) پہلے یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ اگر کائنات کی تمام مختلف مظاہر کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ صرف مادہ اور قوت کی مختلف صورتیں ہیں، لیکن یہ امر بحث طلب رہ جاتا ہے کہ نفس حیات کیا چیز ہے اور اُس کا مدار کیا ہے، بعض طبعیین کا خیال ہے کہ حیات حقیقت میں "قوت" ہی ہے اس لئے نفس حیات کو کوئی علیحدہ مستقل موضوع قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اُن کے نزدیک حیات بھی قوائے طبیعیہ (حرارت، نور، کہربائیت) میں داخل ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات، اِن قوتوں کے علاوہ کوئی اور چیز ہے جسے خالقِ حیات نے مخلوقات میں ودیعت کیا ہے۔

مادیین کی سب سے بڑی دلیل حیات اور قوت کو ایک ہی چیز کہنے کی یہ ہے کہ حیات، قوت کی طرف اور قوت، حیات کی طرف تبدیل ہوجاتی ہے، لیکن بحث وتمحیص کے بعد ان کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہوجاتا ہے۔

مادیین کہتے ہیں کہ ذی حیات، غیر ذی حیات سے پیدا ہوتا ہے، اس کی مثال وہ بکٹیریا (ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں) کو پیش کرتے ہیں جو خود بخود فاسد چیزوں میں پڑجایا کرتے ہیں، اُن کی یہ دلیل غلط ہے کیونکہ یہ بات اب ثابت ہوگئی ہے کہ بکٹیریا، جراثیم اور انڈوں سے اسی طرح پیدا ہوتے ہیں جس طرح اور تمام جانداروں کی تکوین ہوتی ہے، اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ ذی حیات غیر ذی حیات سے پیدا نہیں ہوتا اس حقیقت کو پروفیسر ٹنڈل نے متعدد تجربات سے ثابت کردیا ہے اور یہ تجربات ایسے مشاہدات پر مبنی ہیں کہ کسی طرح باطل نہیں ہوسکتے۔

حیات، اک مستقل شے ہے جو تناسل اور انت [illegible] زندہ چیز سے دوسری زندہ چیز میں پہونچتی ہے ایک طایر انڈے سے پیدا ہوتا [illegible] بھی ذی حیات ہے (اگرچہ وہ حرکت نہیں کرتا اور نہ نشو و نما پاتا ہے) اور حیات کا مبدا، اس میں پوشیدہ ہے، جب مقررہ اسباب اور شرائط پورے ہوتے ہیں تو وہ ظہور میں آجاتا ہے - چھوٹے بڑے پرندے، اور بڑے بڑے حیوانات اور خوردبینی کیڑوں میں صرف جسامت اور حجم کے لحاظ سے فرق ہے لیکن تولید کی حیثیت سے سب مساوی ہیں -

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ مبدا، حیات سب میں مشترک اور متحد ہیں تو اب صرف یہ بحث باقی رہجاتی ہے کہ یہ مادہ یعنی مادۂ حیات کہاں سے آیا اور کس طرح اس کی ابتدا ہوئی - بعض کا خیال ہے کہ یہ مادہ خود بخود پیدا ہو گیا ہے، مگر اس کی پیدائش نہایت تدریج کے ساتھ جمادی مراتب کو طے کرتی ہوئی حیوانیت تک پہونچتی ہے - اس کے لئے لاکھوں برس صرف ہوئے ہیں اور ایک عرصہ کے بعد تمام شرائط اور مناسب حالات کے اجتماع سے یہ مادہ، عالم ظہور میں آیا ہے - اس مذہب کی بنا، پر (یعنی یہ کہ مادہ حیوانی، جمادات کی ترقی یافتہ شکل ہے) یہ لازم آتا ہے کہ جمادات اور حیوانات کے درمیان ایک ایسی متوسط کڑی ہونی چاہیئے جسے ہم حیوان اور جماد دونوں کہہ سکیں اور اس میں دونوں قسم کی خصوصیتیں پائی جائیں، چنانچہ اس مذہب کے علم برداروں نے اپنے اصول کو ثابت کرنے کے لئے دُنیا کے سمندروں میں حتی الامکان خوب جستجو کی مگر اب تک وہ درمیانی کڑی نہ دریافت ہو سکی -

اس سلسلہ میں اک واقعہ ذکر کرنے کے قابل ہے - ایک انگریز عالم طبیعیات جو اسی مذہب کا قائل تھا اُسے سمندروں کے کنارے جلاتینی مادہ، جس میں خفیف سی اہتزازی کیفیت پائی جاتی تھی ملا - اُسے یہ خیال ہوا کہ یہ اہتزاز، اصل میں حرکت حیوانی ہے جو ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے، وہ اس مادہ کو اپنے دارالعمل میں لے گیا تاکہ اس کے متعلق تجربہ کرے اور کسی خاص نتیجہ تک پہونچ سکے راستہ میں اس کا ایک ہم خیال دوست ملا - اس سے عالم موصوف نے بیان کیا کہ مجھے ایک ایسی چیز ملی ہے جس کے متعلق تحقیق کروں گا، ممکن ہے کہ اس سے ہمارا خیال ثابت ہو جائے، اس کے دوست کو یقین ہو گیا کہ واقعی اسے جماد اور حیوان کی درمیانی کڑی مل گئی ہے - چنانچہ فوراً اس نے اس جدید انکشاف کی خبر ملک میں شائع کر دی (درانحالیکہ اس کے دوست کو اس کی خبر نہ تھی)

ایک روز یہ عالم ایک جلسہ میں مدعو گئے ... اس عالم کے اُس دوست نے خطیب کی حیثیت سے اکتشاف کنندہ کی وسعت معلومات اور اس عجیب و غریب اکتشاف کا نہایت تفصیل سے ذکر کیا خطیب نے کہا ہمارے محترم دوست کو عالم نباتات اور حیوان کی درمیانی کڑی، ایک جلاتینی مادہ کی صورت میں مل گئی ہے۔ جو اصلی مبدا رحیات ہونے کی بنا پر اہتزازی حرکت کرتا ہے، اس کے بعد اکتشاف کنندہ کے ذوق علمی اور اس کی عملی کوششوں کی داد دی گئی۔ جب خطیب نے اپنی تقریر ختم کی تو عالم موصوف کھڑا ہوا اور اپنے دوست کی تعریف کرنے کے بعد کہا کہ میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ حضرات کی خدمات میں عرض کرتا ہوں کہ میں اس مادہ کے متعلق تحقیقات کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مادۂ مذکورہ جلاتینی قسم کا ایک بسیط زلالی مادہ ہے، جس میں حیات کا کوئی اثر نہیں ہے اور اس کی حرکت محض ہوا کی وجہ سے تھی۔

ایسا اکثر دیکھا گیا ہے کہ ارباب مذاہب سے زیادہ اُن کے مقلدین کو غلو ہوتا ہے۔ ڈاروِن جس نے اپنی کتاب "اصل الانواع" میں مسئلہ ارتقاء کا ذکر کیا ہے، ایک موقع پر لکھتا ہے کہ "ممکن ہے انسان اور بعض قسم کے بندر ایک ہی اصل سے پیدا ہوئے ہوں اور یہ اصل اب معدوم ہو گئی ہو" لیکن ڈاروِن کے مقلدین نے اس میں حد درجہ غلو سے کام لیا، یہاں تک کہ اب عام طور پر یہی مشہور ہے کہ ڈاروِن کے نزدیک انسان کی اصل بندر ہے۔

حیات اک مبدءِ مستقل ہے، جسے خدا نے مادہ میں منتشر کر دیا ہے، ہمیں اس کی تاریخ معلوم نہیں کہ یہ کب پیدا کیا گیا ہے اور کس طریقہ سے یہ کائنات میں پھیلا ہے، خدا نے اس مادہ کے لئے خاص قوانین و نوامیس مقرر کئے ہیں اور حیات و موت اس مادہ کے اتصال و انفعال کا کرشمہ ہے۔

مادۂ حیوانی کی ترکیب بھی دیگر مرکبات کی طرح، عناصر جمادی سے ہوئی ہے، اگر ہم کسی زندہ جسم کی تحلیل کریں خواہ وہ جسم، حیوان کا ہو یا نباتات کا، تو اس میں سوائے اُن عناصر کے جنہیں ہم پہچانتے ہیں اور کوئی نئی چیز نہ نکلے گی۔ مادۂ حیوانی میں بمقابلہ دیگر عناصر کے کاربن، آکسیجن، ہیڈروجن اور نٹروجن، گندک اور فاسفورس، زیادہ شامل ہیں۔ ماہرین فن نے تمام مرکبات حیاتی کی تحلیل کر لی ہے اور عناصر کی نسبتِ ترکیبی بھی معلوم ہو گئی ہے، مثلاً نشاستہ (گھاس کی ایک قسم) میں ۶ جزو کاربن

اور ۱۰ اجزو ہائیڈروجن اور ۵ جزو آکسیجن شامل ہے، یہ [stain] بات ہے کہ اگر عناصرِ مذکورہ اسی نسبت سے شامل کردئے جائیں تو نشار پیدا نہ ہوگا، حالانکہ یہ سب عناصر، جمادی مادہ کے ہیں جنہیں نباتات، زمین اور ہوا سے حاصل کرتے ہیں۔ پھر ظاہر ہے کہ نبات نے جو حیاتِ حاصل کی ہے وہ محض عناصر کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس میں قوتِ حیات بھی شامل ہے۔

پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ تمام جمادات، نباتات اور حیوانات میں تقریباً ستر بسیط عناصر پائے جاتے ہیں، لیکن یہ سب عناصر جامد اور غیر ذی حیات ہیں اور قوائے طبیعیہ (نور، حرارت اور کہربا) کے فعل سے ان سب میں اُن طبعی اعمال کا ظہور ہوتا ہے جنہیں حیات سے کچھ تعلق نہیں ہے، مگر حیات اک مستقل شئے بلکہ ایک سربستہ راز ہے جو ایک زندہ شے سے دوسری شئے میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے اور چلا جائیگا

لیکن مبداءِ حیات کا راز جس کے ادراک سے ہم سراسر عاجز ہیں، ہمیں اس کے متعلق بحث کرنے سے نہیں روک سکتا۔ اساسِ حیات جس پر نباتاتی اور حیوانی زندگی کی عظیم الشان عمارت قایم ہے، نہایت پر اسرار شئے ہے انسجۂ حیات (Fabrics of life) یا "زندگی کا تار و پود" نہایت چھوٹے چھوٹے کرّوں سے مرکب ہیں، جن میں ایک جلاتینی صاف اور شفاف مادہ بھرا رہتا ہے، جس کا کوئی خاص رنگ نہیں ہوتا اس مادہ کو پروٹوپلازم کہتے ہیں، اس میں تغذیہ، حرکت، تناسل وغیرہ تمام خواصِ حیات پائے جاتے ہیں، انہیں کرّوں کی تالیف و ترکیب سے انسجۂ حیات کی تکوین ہوتی ہے جن پر خواصِ حیات کا بالکل اسی طرح توقف ہے جس طرح مرکباتِ جمادی کے خواص کا توقف جواہر فردہ پر۔

یہ کرّے چھوٹے چھوٹے جراثیم کی طرح انفرادی حالت میں پائے جاتے ہیں، ان میں جو سب سے زیادہ سادی اور بسیط قسم ہے اسے مونیرا کہتے ہیں۔ یہ جلاتینی کرّے ہیں جن پر ایک غلاف ہوتا ہے اور غلاف کے اندر صاف و شفاف زُلال ہوتا ہے، زُلال میں اب تک اعضاء دریافت نہیں ہوئے ہیں، لیکن اس میں حیات کے تمام خواص اصلیہ پائے جاتے ہیں، یہ اپنی غذا اُس مادہ سائلہ سے جذب کرتے ہیں جس میں وہ تیرتے رہتے ہیں اور ان کا تناسل انقسام کے طریقہ پر ہوتا ہے یعنی ایک کرّہ دو میں اور دو تین میں منقسم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مونیرا سب سے زیادہ سادہ اور بسیط حیوانی شکل ہے اور حیات کا پہلا زینہ ہے۔

کرات حیاتی سے اور زیادہ ترقی یافتہ شکل تو تفصیلات کی ہے یہ چڑیوں کے پوٹے کی طرح ہوتے ہیں جس میں پروٹو پلازم پایا جاتا ہے، اس کے وسط میں ایک سیاہ رنگ کا مرکزی حصہ ہوتا ہے اور ان تفصیلات سے بڑے بڑے جاندار مرکب ہوتے ہیں۔ ان کے خواص کا نہایت غور سے مطالعہ کیا گیا ہے اور ماہرین اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ہر پوٹا ایک مستقل حیات کا مالک ہے اور اس میں تناسل بھی پایا جاتا ہے۔

تناسل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب پوٹے کی عمر ختم ہونے کو ہوتی ہے تو وہ پھٹ جاتا ہے اور اس سے چند اور پوٹے پیدا ہوتے ہیں جو اپنی خصوصیات میں اپنی ماں سے بالکل مشابہ ہوتے ہیں یہ پوٹے سائلات جمادی سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں اور جمادی مادہ کو ذی حیات مادہ میں تبدیل کر دیتے ہیں، تاکہ وہ بڑے جانوروں کی غذا بن سکے۔ غرض انہیں پوٹوں سے تمام نباتات اور حیوانات بنتے ہیں لیکن اس طرح کہ پہلے نہایت ہی چھوٹے نباتات و حیوانات پیدا ہوتے ہیں اور ان کی ترکیب سے بہت سے چھوٹے چھوٹے جانور بنتے ہیں جو خود بھی بغیر خوردبین کے نظر نہیں آسکتے۔ گھاس کو اگر پانی میں تر کر دیا جائے تو دو دن کے بعد اس پانی میں یہ چھوٹے جاندار پیدا ہو جاتے ہیں جنکا حجم ۱/۴۰۰۰۰ انچہ سے زیادہ نہیں ہوتا مگر باوجود اس غیر قابل تصور حجم کے ان میں تمام اعمال حیات پائے جاتے ہیں اور کوئی جگہ ان سے خالی نہیں ہے ان کے وجود سے بڑے فوائد مترتب ہوتے ہیں، مثلاً مرنے کے بعد حیوانات کے جو اجزا رہ جاتے ہیں، انہیں یہ کھا جاتے ہیں، اگر یہ چھوٹے جاندار نہ ہوتے تو تمام زمین ان سے بھر جاتی ان جانداروں کا عمل تعفن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، کیونکہ تعفن عبارت ہے اس قسم کے چھوٹے جانداروں کے پیدا ہونے سے جنہیں بکٹیریا کہتے ہیں۔

بکٹیریا کی سب سے زیادہ سادی قسم کو امیبا کہتے ہیں یہ ایک جلاتینی ٹکڑا ہوتا ہے جس کے درمیان ایک مرکزی حصہ ہوتا ہے، یہ ہر طرف حرکت کرتا ہے اور ایک تموجی حرکت سے اپنی غذا جذب کرتا ہے ان میں نشو و نما اور تناسل بھی پایا جاتا ہے اور تناسل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کا درمیانی حصہ چھوٹا ہوتے ہوتے ٹوٹ جاتا ہے اور ایک امیبا کے دو حصہ ہو جاتے ہیں اور دو کے چار اور چار کے آٹھ اور اسی طرح اس کے آگے۔

بکٹیریا کی تمام مختلف قسموں کے متعلق ابھی تک یہ یقین نہیں ہوا ہے کہ یہ حیوان ہیں یا نباتات، بعض

اسے نبات کہتے ہیں اور پروٹیسٹا اس کا نام رکھتے ہیں اور [illegible] سے جانور بناتے ہیں اور اس کا نام پروٹوزا کہتے ہیں لیکن اکثر کی یہی رائے ہے کہ اس میں حیوان اور نبات دونوں کے خواص پائے جاتے ہیں۔

بکٹیریا کے بعد تمام ذی حیات اشیاء کی نباتات اور حیوانات میں تقسیم ہوتی ہے، جو خاصہ حیاتی میں مشترک ہیں، اور تناسل، نمو، تغذیہ دونوں میں پایا جاتا ہے جس طرح ایک حیوان کے جسم میں ذی حیات پوٹے پائے جاتے ہیں اسی طرح نباتات میں بھی ہیں۔ اور جس طرح وہ حیوان کے جسم میں گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں اسی طرح نباتات میں بھی ان کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔

حیوان اور نبات کے طریق تغذیہ میں تھوڑا سا فرق ہے، نباتات براہ راست مادہ جامدہ کو اپنی جنس بنا کر غذا حاصل کرتے ہیں، لیکن حیوان کے لئے ضروری ہے کہ وہ نبات سے غذا حاصل کرے، ہم روٹی کھاتے ہیں جو ایک نباتی مادہ ہے، گوشت کھاتے ہیں جو اصل میں نباتی مادہ ہے کیونکہ جس حیوان کا ہم گوشت کھاتے ہیں اس نے نباتات کھا کر اپنی غذا حاصل کی تھی اور اگر اس نے بھی گوشت کھا کر حاصل کی تھی تو جس جانور کا اُس نے گوشت کھایا تھا اس نے نباتات سے غذا حاصل کی ہوگی، غرض حیوانی غذا، نباتات سے حاصل ہوتی ہے، خواہ بلا واسطہ ہو یا بواسطہ۔ اس کے بعد حیوان اور نبات کی متعدد تقسیمیں ہیں، جنہیں انواع اور اجناس کہتے ہیں، عالم حیوان کی تقسیم حیوانات ذوات الفقرات (ریڑھ کی ہڈی رکھنے والے) اور غیر ذوات الفقرات کی طرف ہوتی ہے، اور اس کے بعد ذوات الفقرات پھر پرندوں، مچھلیوں اور ذات الثدی (تھن رکھنے والے) وغیرہ میں تقسیم ہوتے ہیں، پھر ان میں سے ہر ایک قسم انواع میں منقسم ہوتی ہے مثلاً گھوڑا، اونٹ، کتا، عقاب، کبوتر وغیرہ نباتات کی تقسیم پھول والوں اور بغیر پھول والوں میں ہوتی ہے اور اسی طرح ان کی بھی متعدد اقسام مقرر ہیں۔

حیوان اور نبات کی ہر ایک قسم میں علیحدہ علیحدہ خواص اور صفات پائے جاتے ہیں، جن کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں، لیکن یہ تمام صفات ممیزہ جو ان اقسام کی حدود اور تعریفات خیال کئے جاتے ہیں، یہ پورے طور پر واضح نہیں ہیں، بلکہ آپس میں اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ انواع کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں ہے تو بھی بیجا نہ ہوگا۔ اس وجہ سے مشہور عالم انواع ڈارون اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ تمام انواع حیوان اور نبات ابتدائے آفرنیش سے مستقل اور متمایز انواع کی صورت میں پائے گئے ہیں، بلکہ پہلے چند معمولی قسمیں تھیں اور انہیں میں تباین اور تنوع ہو کر مختلف انواع پیدا ہو گئی ہیں مگر ابھی

تک ڈاروِن کی رائے علمار کے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچی ہے۔

الحاصل، حیات کے متعلق علمار نے اِس وقت تک جو کچھ تحقیقات کی ہے وہ یہ ہے کہ حیات ایک مستقل مبدا رہے جسے خالقِ عالم نے مادہ میں منتشر کر دیا ہے مگر اس کی ابتدا اور کیفیت حدوث کا علم ہم کو نہیں ہے۔ حیات حیات ہی سے پیدا ہوتی ہے، حیات کی حقیقت، تولید کی کیفیت حدوث، ولادت اور موت کی حقیقت ابھی تک سربستہ راز ہیں اور انسان کو اُن کے متعلق چند سطحی معلومات کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا ہے، حقیقت اور تفصیل ابھی تک پوشیدہ ہے، عاقل اور حقیقت شناس وہی ہے جو اپنے عجز کا اعتراف کرے۔ وسیع کائنات میں انسان کیا چیز ہے جبکہ سارا انظام شمسی اس محیطِ اعظم کے مقابلہ میں وہی نسبت رکھتا ہے جو ایک قطرہ کو بحرِ ناپیدا کنار سے حاصل ہے۔

شادی

۱۔ شادی ایک قید خانہ ہے جس میں کوئی دلکشی نہیں سوائے اُس کے دروازہ کے، اور اس سے نجات نہیں سوائے موت کے۔ (فیلامون)

۲۔ شادی کی فکر کرنا گویا مچھلی کا ماہی گیر کے جال کے چاروں طرف چکر لگانا ہے۔ (سقراط)

۳۔ شادی کا انجام اس وقت اچھا ہوسکتا ہے، جب شوہر گونگا بن جائے اور بیوی اندھی۔ (ڈاراگون)

۴۔ شادی کرنا گویا ایسے تھیلے میں ہاتھ ڈالنا ہے جس کے اندر ایک مچھلی ہے اور دس سانپ۔ (سلڈن)

۵۔ شادی اک شراب ہے جس کی نوعیت کا حال دوسرے جام پر معلوم ہوسکتا ہے۔ (جرولڈ)

۶۔ شادی اک قسم کا جُوا ہے جس میں مرد اپنی آزادی کی بازی لگاتا ہے اور عورت اپنی نیکی کی (بارکر)

۷۔ شادی کی بہترین صورت یہ ہے کہ دو مختلف عنصر اس سے وابستہ ہوں۔ (بارکر)

نپولین اور جوزفاین

ساحلِ فرانس سے قریب سو میل کے فاصلہ پر، وسطِ بحرِ روم میں جزیرہ کورسیکا کے شہر اجیشیو کا ایک معمولی انسان جو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ایک فرانک کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے، دفعتاً اپنے دل میں قوم کا درد لے کر اٹھتا ہے اور ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے فوج کا ایک لفٹنٹ بنکر نپولین اعظم بن جاتا ہے۔

جزیرہ کورسیکا میں ایک سنسان مقام پر ایک ہموار چٹان واقع ہے، اور اس کے ایک کھوہ میں جو "نپولین کی گپھا" کے نام سے اس وقت تک مشہور ہے اس خلوت گاہ میں پرفکر و پرخیال نپولین اکثر موسم گرما کی طویل دوپہروں میں کتاب کا مطالعہ کیا کرتا تھا، یہ خلوت پسند اور خاموش انسان ہر وقت اداس کسی انہماک میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔

اس وقت جبکہ وہ اپنی خداداد قابلیت سے لفٹنٹ کے عہدہ پر مامور تھا، فرانس میں وہ طوائف الملوکی برپا تھی کہ امن و چین کا کہیں پتہ نہ تھا، اس نے سب سے پہلے اس ہنگامہ کو فرو کیا، اور پھر طولون (فرانس کے ساحل جنوبی کا بندرگاہ) میں ان انگریزوں کو ہزیمت پہونچائی جو فرانس کی حکومت جمہور کے طرفداروں پر حملہ آور ہوئے تھے۔

اس کے بعد یہ اٹلی کی فرانسیسی افواج کا سپہ سالار بنا دیا گیا اور پھر آسٹریا کی فوج کو ہزیمت دیکر اور اس سے اپنی مرضی کے موافق صلح کر کے فاتحانہ حیثیت سے فرانس کے دارالحکومت پیرس کو واپس آیا، جس سے اس کی شہرت عالمگیر ہو گئی۔

ادھر یہ حالت تھی اور ادھر حسین جوزیفائن جزیرہ مارٹی نکو کے نارجیلی جھنڈوں اور کنج نارنج کے سایہ تلے منطقہ محترقہ میں پرورش پاکر اپنی ضیائے حسن سے ایک عالم کو منور کر رہی تھی، جزیرہ کورسیکا اور جزیرہ مارٹینکو میں اگرچہ بُعد المشرقین تھا، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اتنے دور و دراز فاصلہ پر فطرت، دو ایسی روحوں کی پرورش کر رہی تھی جو کسی دن ایک ہو جانے والی تھیں۔

پرشباب جوزیفاین جب فرانس پہونچی تو اس کے حسن صورت کی تعریف میں نہ صرف مرد بلکہ وہ حسین عورتیں بھی جو اپنے حسن و جمال کے فخر و غرور سے زمین پر قدم نہ رکھتی تھیں، ہم زبان نظر آنے لگیں

اور حسین دوشیزگان فرانس جوزیفائن کی تعریف سُن سُن کر اکثر اس سے ملنے کی مشتاق ہوگئیں۔

فرانس میں اگر ایک طرف نپولین کی بہادری و شجاعت کے کارنامے پڑھے جاتے تھے تو دوسری طرف جوزیفائن کے حسن و جمال کا بھی گھر گھر چرچا تھا۔

جوزیفائن سُن چکی تھی کہ بونا پارٹ ایسا آدمی ہے کہ جو شخص اس کے قریب جاتا ہے وہ اُسی پر حکومت کرنا چاہتا ہے اور وہ ایک ایسا انسان ہے کہ ہر معاملہ پر نہایت خوش اسلوبی سے گفتگو کر کے سامعین کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ وہ ایسا حساس ہے کہ انسان کے دل کا حال اکثر اوقات اس کے چہرہ سے محسوس کر لیتا ہے، اس کی متجسس نظر میں ایک ایسی انوکھی اور غیر قابل تصریح بات ہے کہ جس سے فرانس کے بڑے بڑے مدبر مرعوب ہو جاتے ہیں۔

ہر چند شوق دید نے اُسے بیتاب کر رکھا تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کو دیکھ لے، لیکن وہ خائف تھی کہ کہیں دوسروں کی طرح وہ بھی اس کی گرویدہ نہ ہو جائے، تاہم وہ ایک روز نپولین سے ملی اور اس طرح ملی کہ چشم زدن میں دونوں کی روحیں فضائے محبت کے خلائے بسیط میں صعود کر آئیں۔ دُنیا کا وہ فاتح جو یورپ کے تخت نشینوں سے مغلوب نہ ہوا تھا اور جس نے اپنے وطن مقدس کی حمایت میں بڑے بڑے بہادروں کے دلوں کو کپکپا رکھا تھا، اس وقت ایک اور صرف ایک نگہ سحر آگیں کے سامنے کھڑا کانپ رہا تھا اور اپنی سطوت و ہیبت کو تاراج ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ نورانی ہستی سطح انسانی سے بہت بلند ہے اور اس لئے ضرور یہ کوئی آسمان کی ساحرہ ہے جو میری روح کو گھلائے دیتی ہے۔ جوزیفائن، نپولین کے کمرہ میں چند ساعت بیٹھ کر اور یہ دیکھ کر کہ نوجوان سپہ سالار اپنے ملکی کام میں مشغول ہونا چاہتا ہے سرسری گفتگو کے بعد "خدا حافظ" کہہ کر چلی آئی، اور اس دماغ کو جو ملک کے عشق و محبت میں ڈوبا ہوا تھا چند روز کے لئے بیکار کر گئی۔

اس واقعہ کو چند روز ہوئے تھے کہ نپولین اور جوزیفائن کی حالت دگرگوں ہونے لگی، اور اس دوران میں بہادر نپولین کئی مرتبہ جوزیفائن سے ملاقات کرنے گیا۔ اگر برس دونوں کی متواتر ملاقات کے مفہوم کو مفہوم محبت نہ قرار دیتا اور اس کی کوئی تدبیر نہ کرتا تو یہ بالکل یقینی تھا کہ نپولین اعظم کی فتوحات کا سلسلہ جلد مسدود ہو جاتا اور آج اس فاتح اعظم کا نام بجائے قائدین عالم کے قیس و فرہاد کی فہرست میں نظر آتا۔

لیکن برس جو نپولین کا دوست تھا اور جو اسی کی بدولت فرانس کا ڈائرکٹر بن گیا تھا، اس نے فوراً

نپولین اور جوزیفائن کے متعلق شادی کی تدبیر سوچی، کیونکہ وہ اِس شادی کو نہ صرف طرفین کے لئے بلکہ ملک و قوم کے لئے مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا تھا۔

ہر چند نپولین کا متاعِ صبر و استقلال، جوزیفائن کے عشق میں تاراج ہو رہا تھا، لیکن وہ اپنے وطنِ مقدس کے اہم فرائض سے ایک لمحہ کے لئے غافل نہ تھا، تمام دن کے قومی مشاغل اور کتب بینی کے بعد جس وقت شام کو وہ جوزیفائن کے کمرہ میں داخل ہوتا تھا تو اس کی کسل و تکان دُور ہو جاتی تھی اور وہ محسوس کرتا تھا کہ میں کسی حُسن کی ملکہ یا حور کے پاس بیٹھا ہوں۔

بیرس، جو دونوں کی شادی کی دُھن میں لگا ہوا تھا بالآخر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوا اور ۶ مارچ ۱۷۹۶ء کو اس وقت جبکہ نپولین و جوزیفائن کی محبت کا شباب تھا، شادی ہو گئی۔

ملحد فرانس میں اُس وقت عام طور سے نکاح کی کوئی مذہبی حیثیت قائم نہ تھی۔ اور وہ اک نہایت ہی نا استوار عہد قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن نپولین اور جوزیفائن کی شادی یورپین طرز کی شادی نہ تھی، بلکہ اس میں وہ ایشیائی شان تھی، جہاں عروس شوہر کو اپنا سرتاج اور خاوند اپنی بیوی کو اپنا ہمدم و ہمراز سمجھ کر محبت کا فرض ادا کرتا ہے، اور جہاں شادی جیسی پاک و مذہبی چیز کو بازاری سودا نہیں خیال کیا جاتا۔

نپولین، یورپ کے لوگوں کی طرح ملحد نہ تھا کیونکہ اس کا مقولہ تھا کہ "زندگی کے اس بحرِ ذخار میں جب حیاتِ انسانی کی کشتی چھوڑ دی جاتی ہے، تو وہ اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ اور کہاں جاؤں گا؟ بھیدوں کے بھرے ہوئے یہ سوال انسان کو مذہب کی طرف کھینچتے ہیں اور اُن سے دلوں میں خوف و ہراس کے ساتھ ایک قسم کا اطمینان پیدا ہوتا ہے، خدا کے وجود کے ہم قائل ہیں، کیونکہ جس چیز کو ہم دیکھتے ہیں وہ پکار پکار کے خدا کے وجود کا اعلان کرتی ہے، دل کو ایمان کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح جسم کو غذا کی، ہم کو چون و چرا نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے ایمان میں لغزش اور قلب پر تاریکی چھا جاتی ہے"

الغرض شادی کے چند روز بعد نپولین اپنی پیاری محبوبہ کو پیرس چھوڑ کر افواج اٹلی کے صدر مقام نیلس کو روانہ ہو گیا۔ یہ خاموش تھا، اداس تھا، ایسا اداس کہ اس سے قبل وہ اپنی زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا، اک طرف اس کے دل میں اپنی پیاری بیوی کے فراق کی آگ مشتعل تھی اور دوسری طرف اپنی

فوج کا خیال اُسے مضطرب کئے ہوئے تھا، کیونکہ دشمن نے اُسے محصور کر لیا تھا۔ انگلستان کے بیڑے فرانس کے ساحلوں پر منڈلا رہے تھے، آسٹریا کی دو لاکھ فوج دریائے رین کے کنارے پہونچ چکی تھی، تاکہ فرانس پر شمال سے حملہ آور ہو اور ماتحت اٹلی کے صوبوں کو حکم دے دیا گیا تھا کہ بشرکت انگلستان شاہ سارڈینیا کی فوجوں اور نیپلس کی اسی ہزار خونخوار فوج کے ساتھ مل کر حملہ کریں۔

ایک طرف یہ تمام فوجیں تجربہ کار افسروں کی ماتحتی میں سامانِ حرب سے آراستہ کی جارہی تھیں، اور دوسری طرف تنہا نپولین، اس آنے والے خونی منظر میں اپنی تیس ہزار شکستہ دل فوج کا سپہ سالار نظر آرہا تھا، فرانسیسی گورنمنٹ مفلس تھی اور اپنی فوجوں کی تنخواہ بھی نہ دے سکتی تھی۔ سپاہی بے دل اور شکستہ حال تھے ایسے شکستہ حال کہ بدن پر کپڑے پھٹ کر چیتھڑے ہوگئے تھے، پہاڑوں کی سرد چوٹیوں پہ گھوڑے مر رہے تھے اور اس کی فوج کے پاس کوئی توپ خانہ تک نہ تھا۔

اس نوجوان سپہ سالار نے پہونچتے ہی سب سے پہلے اپنے جنرلوں کو طلب کیا اور ان سب کو مخاطب کر کے کہا:۔

"وہ زمانہ گذر گیا، جب مخالفین باہمی تصفیہ سے میدانِ جنگ منتخب کیا کرتے تھے، اور ٹوپیاں ہاتھوں میں لے کر باادب کہا کرتے تھے کہ کیا ازراہِ مہربانی آپ حملہ کریں گے؟ اس وقت ہمیں لازم ہے کہ غنیم کا سر کاٹ کر پارہ پارہ کر دیں، اُن کی فوجوں پر سیلاب کی طرح ٹوٹ پڑیں اور برق کی طرح گر کر اُن کو خاک سیاہ کر دیں، اگر تم میرے ان لفظوں کو حملہ کے وقت پیشِ نظر رکھوگے تو یقیناً دشمن ہمارے سامنے سے اس طرح بھاگ جائے گا، جس طرح طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کے سامنے ظلمتِ شب کافور ہو جاتی ہے۔"

نپولین کا یہ مختصر مگر جامع اعلان، فوج کے ہر رسالہ اور رسالہ کے ہر سپاہی کے کانوں تک پہونچا دیا گیا، جس سے شکستہ دل فوج کی روح میں ایک نیا جوش پیدا ہوگیا۔

دفعتہً دونوں طرف سے حملے شروع ہوگئے، حملوں کا شور، جانکنی کی چیخیں، نوجوانوں کی لاشیں، ہزاروں جسموں کا خاک و خون میں ملجانا، ہڈیوں کا گھوڑوں کے سموں اور توپ خانوں کی گاڑیوں کے پہیوں کے نیچے کچل جانا۔ اور طرح طرح کی ہولناک آتشزدگیوں کا نمودار ہونا ایک ایسا خونی منظر بن گیا، جس کو انسانیت اور رحمدلی کی نگاہ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

جب نپولین کے بھوکے سپاہی، بے خواب و بے آرام، سردے میں ٹھٹھرے ہوئے، کیچڑ اور دلدل میں پھنسے ہوئے رات کی ظلمت و طوفان کی تیرگی میں گرتے پڑتے سیلاب کی طرح غنیم پر ٹوٹ پڑے، تو آسٹریا کی فوج کے پیر اُکھڑ گئے۔

ٹھیک اسی وقت جبکہ یہ آگ اور خون کا کھیل کھیلا جا رہا تھا، نپولین اس ہنگامۂ قیامت زا میں دفعتہً بیتاب ہو گیا۔ کس لئے؟ اس لئے کہ اس وقت اس کی پیاری محبوبہ جوزیفائن کی تصویر اس کی آنکھوں کے روبرو تھی، اس نے متواتر سات روز تک نہ کھانا کھایا تھا، اور نہ آرام کیا تھا، یہاں تک کہ کیچڑ میں بھرا ہوا کوٹ اور بوٹ بھی جسم سے نہ اُتارا تھا، لیکن اس نے جوزیفائن کو ایک محبت آمیز خط لکھنے کا وقت نکالا اور قاصد کو دے کر پھر جنگ میں شریک ہو گیا۔ اس کے بعد بھی اس نے بارہا میدانِ جنگ سے جوزیفائن کے نام خطوط بھیجے، لیکن جب میدان جنگ میں نپولین کے لئے جوزیفائن کی جدائی ناقابل برداشت ہو گئی، تو اس نے جوزیفائن کی وہ چھوٹی سی تصویر جو اُسے شادی کے وقت ملی تھی ایک فیتہ میں آویزاں کر کے اپنے گلے میں اس طریقہ سے ڈالی کہ اس تصویر کا حسین رخسار ہر وقت نپولین کے متحرک دل سے مس ہوتا رہتا تھا، جس سے اُسے ایک گونہ تسلی ہوتی تھی، میدانِ جنگ میں جب یہ اُداس ہوتا تھا تو اکثر تنہائی میں اس چھوٹے سے مرقع سے پیار کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اور اس کو اپنا ہمدم و ہمراز سمجھتا تھا۔

ایک موقع پر میدانِ جنگ سے وہ لکھتا ہے "جانِ من، یہ کیا اسرار ہے کہ تمہارا خیال اکثر میری ذہنی و بدنی قوتوں کو ضعیف بناتا رہتا ہے؟ کوئی لمحہ تمہارے تصور سے خالی نہیں جاتا، یہ کیا سحر ہے، جس سے میں دیوانہ سا ہوا جاتا ہوں؟ میں کیا بتاؤں کہ میرے مقدر میں کیا لکھا ہے؟ ایک زمانہ تھا کہ مجھے اپنی ہمت و شجاعت پر فخر و ناز تھا، بڑے سے بڑے خطرہ کو میں استقلال کی نظر سے دیکھتا تھا، یا اب ہوں کہ تمہارا خیال میری روح کو تباہ کئے دیتا ہے اے بے نظیر ہمدم، یہ کیسا عذاب ہے؟"

جب نپولین کو جوزیفائن کے اس حسین مرقع سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اُس نے جوزیفائن کو اپنے صدر مقام پر بلا لیا، اور اپنی تھوڑی سی فرصت کے لمحوں کو جو بمشکل اسے میسر ہوتے تھے، اسی کے پاس گذارا کرتا تھا، جنگ کے وقت وہ اس کو قریب کے کسی محفوظ مقام پر پہونچا دیا کرتا تھا۔

ایک روز جبکہ وہ نپولین سے رخصت ہو رہی تھی، اُس نے دیکھا کہ مجروحوں کی ایک گاڑی بھری ہوئی

جارہی ہے۔ یہ دیکھکر وہ نپولین کے گلے میں اپنی نازک باہیں ڈال کر زار و قطار رونے لگی، نپولین نے اُسے گلے لگا کر کہا کہ

"اے آرام جاں، تیری آنکھوں سے جس قدر آنسو گرے ہیں، ہر آنسو کے بدلے دشمن کے بے شمار آدمیوں کو ہلاک کردوں گا۔"

تاریک رات کے نصف حصہ میں صبح تک وہ آنے والی جنگ کی طیاریوں میں پھر مصروف ہو گیا، سورج نکلنے سے قبل سپاہی اُٹھے اور خونی شکاری کتوں کی طرح دہوئیں اور کُہر میں ایک دوسرے پر دوڑنے لگے، اِن خوفناک حملوں میں توپ کا ایک گولہ نپولین کے گھوڑے پر آکر گرا، جس سے یہ زوردار جانور شدتِ درد سے بے قابو ہو کر اور دہانہ دانتوں میں دبا کر گولیوں اور گولوں کی بوچھار میں آسٹریا کی صفوں کو چیرتا پھاڑتا نکل گیا، لیکن جانکنی کی تکلیف سے دلدل میں پھنس کر وہیں مرگیا۔ نپولین بھی اِس دلدل میں تا بہ گردن دھنس گیا اور اِس وقت اُسے خیال ہوا کہ اگر جلد اِس دلدل سے نہیں نکلا تو یا تو اسی میں غرق ہو کر رہ جاؤں گا یا کوئی آسٹریا کا سپاہی آکر میرا سر تن سے جدا کرے گا۔

لیکن توپوں کے دہوئیں اور کہر میں اُسے کوئی نہ پہچان سکا، اتنے عرصہ میں نپولین کے آٹھ ہزار سپاہی مارے جا چکے تھے پرستارانِ وطن کو جب یہ معلوم ہوا کہ اُن کا محبوب جنرل غائب ہے تو حواس باختہ ہو کر اپنے جنرل کی تلاش میں وہ دشمن پر بجلیوں کی طرح ٹوٹ پڑے، اِس جوشِ غضب اور آتش و خوں کی بارش میں آسٹریا کے بیس ہزار سپاہیوں کو تہ تیغ کر کے نپولین کو دلدل سے نکال لائے، تھکا ماندہ نپولین جس کے بدن پر دو چار زخم بھی آگئے تھے آتے ہی پھر جنگ میں شریک ہو گیا، اِس کے سپاہیوں نے یہ دیکھکر خوشی کا ایک نعرہ مارا، جس سے دفعۃً غنیم کی فوجوں میں ہلچل پڑ گئی، اور آن کی آن میں درہم برہم ہو گئیں۔

ہر چند کہ ابھی غنیم کے تعاقب میں نپولین کی توپیں گرج رہی تھیں، کہ اس کی محبوبہ کے خیال نے آکر اُسے بے چین کر دیا، اِس نے فوراً ایک خط لکھا اور اِس تیزی سے لکھا کہ فقرے لفظوں میں اور لفظ حرفوں میں گتھ گئے، نپولین نے یہ خط ایک قاصد کے ہاتھ روانہ کیا اور جوزیفاین بمشکل اُسے پڑھ سکی، اس میں لکھا تھا۔

"پیاری جوزیفاین، میں زندہ ہوں اور اب موت میرے سامنے سے بہت دور ہے، تیری محبت میرے فتوحات کی محرک ہے اور تیرے شوقِ ملاقات کی عجلت میں مانتوا جلد ہمارا ہوا جاتا ہے، تیرا وفادار نپولین جلد تجھے اپنے آغوشِ شوق میں لیکر محبت کا بے انتہا ثبوت دیگا، میں ذرا تھک گیا ہوں، لیکن تجھے بھولا نہیں ہوں

اپنی خیریت سے جلد اطلاع کرنا۔"

اس وقت جبکہ نپولین، مانٹی بیلون میں اپنی مظفر و منصور فوج کو دیکھ دیکھ کر مسرور ہو رہا تھا، جوزیفائن بڑی خوبی و شائستگی سے، ملان کی ذی شان جماعت کی میرمجلسی کر رہی تھی، اگر نپولین کے ہاتھ میں یورپ کی قسمت کی باگ تھی اور اس کی ترقی و تنزل اس کے ایک اشارہ پر منحصر تھی، جس سے بڑے بڑے بادشاہ و نواب زادے اس سے حصول دوستی کی تمنائیں کر رہے تھے، تو جوزیفائن بھی اپنے حسن و جمال سے مرجع تحسین ہو رہی تھی۔

نپولین کی فتوحات نے جس وقت تمام یورپ پر تسلط کر لیا اور فرانس کی پبلک عام طور سے آزاد ہو گئی نہ صرف فرانس بلکہ یورپ کے چار کروڑ انسانوں کے دلوں میں جب اس ایک تنہا ہستی نے اپنی محبت کا سکّہ جما لیا اور جمہور یورپ اس کے منہ کی نکالی ہوئی بات کو ایک قانون سمجھنے لگا اور یقین کرنے لگا کہ نپولین اور صرف نپولین ہی ہمارا تنہا حامی و مددگار ہے، تو انہیں ایک فرمانروا کی ضرورت محسوس ہوئی، اور یہ فرمانروا اُن کی تجویز میں سوا نپولین کے اور کون ہو سکتا تھا۔

نپولین کو اگرچہ صرف "فرسٹ کانسل" کا خطاب عطا ہوا تھا، لیکن درحقیقت نپولین اب ایک شہنشاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جوزیفائن، حساس جوزیفائن بڑے تردد سے اس حیرت انگیز اقتدار پر غور کرنے لگی جو اب نپولین کو حاصل ہو چکا تھا وہ یہ دیکھکر کہ اب اس کے اختیارات اور اس کی طاقت دنیا کے بادشاہوں پر حاوی ہے، اس کے خوشی کی انتہا نہ تھی، لیکن اس خوشی میں، اس مسرت میں آنے والے وقت کا ایک تاریک لمحہ کبھی کبھی اس کو مایوس کر جاتا تھا۔

وہ ایک پھول کی طرح مرجھا جاتی تھی اور ایک شاخ کی طرح کانپنے لگتی تھی اس خیال سے کہ نپولین سے اس کے کوئی اولاد نہ تھی یہ مرجھانا اور کانپ جانا تو اولاد کے لئے تھا، نہ تاج و تخت کے چھن جانے کے لئے، بلکہ فرانس اپنے امن و چین کے لئے ایک وارث چاہتا تھا اور امور سلطنت کو مدِ نظر رکھ کر نپولین پر زور دیا جا رہا تھا کہ وہ جوزیفائن کو طلاق دیدے۔ اور دوسری شادی کر لے، کیونکہ جوزیفائن کے نپولین سے باوجود پندرہ سال گذر جانے کے کوئی بچّہ نہ ہوا تھا اور آیندہ اس کی امید بھی نہیں تھی۔

ایک روز جبکہ نپولین تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا عمیق فکر میں ڈوبا ہوا تھا، جوزیفائن آہستہ سے اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے پہلو میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اپنی بھرّائی ہوئی آواز میں بولی، میرے

اچھے شوہر میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ تم بادشاہ بننا پسند نہ کرنا۔ نپولین اس کے درد دل کو محسوس کر کے کانپ گیا اور وہ حیران تھا کہ مصیبت زدہ جوزیفائن کو کیا جواب دے، تاہم اس نے سمجھایا تسلی دی اور کہا کہ اس وقت میں اپنے ملکی کام میں مشغول ہوں تم مجھے تنہا چھوڑ دو اور اندیشہ نہ کرو،

ہر چند کہ جوزیفائن اپنے شوہر کی شدتِ محبت سے واقف تھی، لیکن اسی کے ساتھ وہ اس کے وطن مقدس کے جذبہ سے بھی آگاہ تھی، وہ اس سے بے خبر نہ تھی کہ نپولین اور اس کی رعایا کو ایک وارث کی اشد ضرورت ہے وہ جانتی تھی کہ تمام فرانس میں شادی صرف باہمی رضامندی کا نام ہے، لیکن طلاق کے تصور سے نپولین اور جوزیفائن دونوں کی روح میں کپکپی سی پیدا ہو جاتی تھی، نپولین کسی طرح نہ چاہتا تھا کہ اپنی پیاری بیوی کو طلاق دے، کیونکہ طلاق کے لفظ سے اس کے بدن میں رعشہ پڑ جاتا تھا، اور وہ تنہائی میں چپ چپ کر روتا تھا، لیکن جمہور کا طلاق کے لئے زور دینا اور ملک کی بہبودی کا خیال اس کو مارے ڈالتا تھا، بالآخر نومبر ۱۸۰۹ء کا منحوس آخری دن آیا اور یہ خوفناک پیغام اس کے کانوں تک پہونچا دیا گیا۔

سیل اشک سے نہائی ہوئی جوزیفائن اس وقت اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی ہے، نپولین اپنی ستائی ہوئی غمزدہ بیوی کے پاس آنے کی ہمت کرتا ہے، لیکن میدانِ جنگ سے کہیں زیادہ مہیب جوزیفائن کے کمرے کی ویرانی کو محسوس کرتا ہے بالآخر غم کی یہ دونوں تصویریں، ایک میز کے کنارے بیٹھتی ہیں، لیکن اس روح فرسا صدمہ سے دونوں کی زبان بند ہے، ایک لفظ منہ سے نہیں نکلتا، مختلف کھانوں کی طشتریاں آتی ہیں اور بغیر چکھے اسی طرح واپس کر دی جاتی ہیں۔ دونوں کے دل کا حال زردیٔ رخ سے ہویدا ہے، سنگ مرمر کے بت کے مانند جوزیفائن خاموش بیٹھی ہے اور نپولین سوگوار، عالم خاموشی میں چھری ہاتھ میں لئے ہوئے گلاس کو کھٹکھٹا رہا ہے، کھانے کی رسم ادا کرنے کے بعد نپولین نے دروازے بند کر لئے اور اب یہ دونوں تنہا رہ گئے، ہر چند کہ نپولین کے منہ پر مردنی چھائی ہوئی ہے، بدن کی بوٹی بوٹی کانپ رہی ہے، تاہم اس نے اپنی کانپتی ہوئی زبان سے کہا۔

"جوزیفائن، میری پیاری جوزیفائن، تم جانتی ہو، مجھے جس قدر تم سے محبت ہے، اس وسیع آسمان کے نیچے چند مسرت آمیز لمحات اگر مجھے نصیب ہوئے تو وہ صرف تمہارا ہی طفیل تھا، میری ہمت و شجاعت میں اضافہ کرنے والا تمہارے ہی شوق ملاقات کا جذبہ تھا، مگر آہ میری تدبیر پر تقدیر غالب آگئی، میرے

مقدر میں یہی لکھا ہے کہ میں ملک و قوم کی بہبودی و بھلائی کے لئے اس چیز کو نثار کر دوں، جس کو ہمیشہ میں نے جان سے زیادہ عزیز رکھا ہے جس سے اکثر میں نے مسرت حاصل کی ہے۔"

جوزیفائن غش کھا کر گر پڑی، نپولین گھبرا گیا، لوگ دوڑے ہوئے آئے اور اس بیہوش و نازک ہستی کو اٹھا کر ایک دوسرے کمرے میں لے گئے مگر آہ اس کے نازک لب متحرک تھے، جن سے وہ کہہ رہی تھی، "نہیں ہرگز نہیں تم ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مار نہ ڈالو گے۔"

نپولین کی روح پر صدمہ تھا، تمام شب وہ جوزیفائن کے کمرے میں ٹہلتا رہا، آنکھیں سرخ ہو کر ورم کر آئیں، لوگ اس کی حالت دیکھ کر خاموش تھے اور سب پر ایک مایوسی چھا گئی تھی، یہ دیکھ کر کہ وہ صبح تک ایک لمحہ نہیں سویا۔ نپولین نے سب کو مخاطب کر کے اپنی درد بھری آواز میں کہا:۔

"دوستو۔ فرانس کے مقاصد نے میری قسمت کو تباہ کر دیا، وطن کی محبت چاہتی ہے کہ میں اس پر اپنی سب سے زیادہ عزیز چیز نثار کر دوں، اہل وطن کا درد میری روح کو ایک عرصہ سے تحلیل کئے دیتا تھا آج اس کی خواہش ہے کہ وہ میرے کلیجے کو پاش پاش کر دے، میرا متاع صبر تاراج ہو رہا ہے، میرے دماغ میں چکر ہے، میرا قلب پھٹا جاتا ہے اور آہ میرا زخم دل میرے سینے سے باہر ہوا جاتا ہے، کوئی ہے جو اس نیلگوں آسمان کے نیچے مجھے تباہی و بربادی سے بچا سکے۔ آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ زندگی میں یہ روح فرسا حادثہ پیش آئے گا اور غم و الم، آسمان و زمین مجھے پیس ڈالیں گے۔ ہاں اے وطن پرستو، وطن کے پروانو، تم گواہ رہنا کہ سرزمین وطن کے لئے میں اپنی پیاری . . . . کی روح کو تباہ و برباد کر رہا ہوں۔"

اتنا کہا اور جوانمرد و بہادر انسان کی آنکھوں سے خون کے آنسو جاری ہو گئے، اور بدن سرد پڑ گیا۔

نپولین مصیبت زدہ نپولین شاہی لباس پہنے ہوئے ایک ستون کے سہارے ٹیک لگائے مردہ کے مانند بے حس و حرکت کھڑا ہے، صف ماتم بچھی ہوتی ہے، سوگواروں کا مجمع ہے، کمرے کے وسط میں گول میز پر سونے کا ایک قلمدان رکھا ہے اور میز کے قریب ایک خالی کرسی بچھی ہے، دفعتاً جوزیفائن چند خواصوں کے سہارے سے اس کمرے میں لائی جاتی ہے، یہ ایک سفید ململ کا لباس پہنے ہوئے اور خود اس وقت ململ سے زیادہ سپید نظر آ رہی ہے، اس کے نازک رخساروں پر کھوتے ہوئے آنسو کے قطرے گر رہے ہیں، مُردنی چھائی ہوئی ہے اور ہچکیوں کا تار برابر جاری ہے۔

یہ اس خالی کرسی پر لا کر بٹھا دی گئی، اور جس وقت اس غم کی تصویر کو طلاق کا اعلان پڑھ کر

سُنایا گیا۔ چند لمحوں کے لئے بے ہوش ہوگئی، مجمع پر ایک سکوت تھا، در و دیوار پر حسرت چھائی ہوئی تھی، لیکن جوزیفاین کو جب کچھ ہوش ہوا تو اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے طلاق نامے پر دستخط کر دئے۔ اور اس طرح وطن کے مقاصد نے اور سرزمین وطن کے چمکتے ہوئے ذروں کی محبت نے اپنی غرض کے لئے، دو ایسی روحوں کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا جن کو فطرت نے ایک ساتھ رہنے کے لئے وضع کیا تھا۔

اَمام

پروانہ

اے سوز کے دیوانے، اے عشق کے پروانے　　اے موت سے بیگانے، اے شمع کے پروانے
تو قیس ہے سرتاپا، اور شمع تیری لیلیٰ

سرشار محبت ہے، پروردۂ فرقت ہے　　خوگردۂ وحشت ہے، جاں دادۂ الفت ہے
سودا ہے ترا سودا، ہے عشق میں تو یکتا

ننھا سا یہ دل تیرا، ہے طور محبت کا　　موسیٰ کو بھی سودا تھا، لیکن نہ ترا ایسا
ہوتا وہ اگر پختہ، لازم تھا کہ جل جاتا

جلوہ جو اُدھر دیکھا، بیتاب ہوا کیسا　　تھی دیدِ رُخِ زیبا، پیغام اجل گویا
کیا ذوقِ محبت ہے، کیا شوقِ شہادت ہے!

امین حزیں

کارل مارکس

(بہ سلسلہ اشاعت گذشتہ)

بروسلز میں انجمن کا قیام اب مارکس بروسلز پہونچ گیا جہاں اس نے جرمنی کے دوسرے جلا وطنوں اور جرمنی کے طبقہ کمیونسٹ (Communists) سے ملاقات کی، اور اب اس نے پہلی دفعہ یورپ کی کمیونسٹ (Communist) تحریکات کا عملی طور پر ساتھ دیا۔ اس نے جرمن مزدوروں کی ایک سوسائٹی قایم کی، اور ایک پرچہ نکالا جو جرمنی جلاوطنوں کی طرف سے شایع ہوتا تھا، وہ دن و رات اپنے خیالات کی تبلیغ میں کوشاں تھا۔ مزدوروں کے سامنے اقتصادیات پر لکچر دیتا تھا۔ کارل بروسلز میں تین سال رہا اور منجملہ دیگر سرگرمیوں کے فرانس اور جرمنی کے لیڈروں سے بہت زیادہ خط و کتابت کرتا رہتا تھا۔

خفیہ سوسائٹی سے تعلق مارکس نے جرمن مزدوروں کی جو سوسائٹی قایم کی تھی، اس کو اس نے جرمنی کی ایک خفیہ سوسائٹی لیگ آف جسٹ (League of Just) سے، جسے جرمنی کے انقلابی لیڈر ولیم وٹلنگ نے قایم کی تھی، ملحق کر دیا۔ اس انجمن کی شاخیں فرانس اور لندن میں بھی تھیں اب مارکس نے اس امر کی کوشش کی کہ مختلف کمیونسٹ سوسائٹیوں کو ایک بڑی لیگ کی صدارت میں قایم کردے اور آخر کار یہ سب انجمنیں متحد ہو گئیں اور لیگ آف کمیونسٹس (League of Communist) کہلانے لگی۔ اس کے بعد اس جماعت نے سازش اور پروپگنڈا عملاً شروع کر دیا اور مارکس نے دنیا کے مشہور و معروف کمیونسٹ اعلان کا مسودہ ۱۸۴۷ء کے اخیر میں طیار کرنا شروع کیا۔ یہ اعلان ۲۴ فروری ۱۸۴۸ء کو مطبع سے نکلا اور اسی دن دنیا کو یہ معلوم ہو گیا کہ پیرس میں انقلاب ہو گیا ہے اور جمہوری حکومت قایم ہو گئی ہے۔ یہی وہ دن تھا جب فرانسیسی مرغ نے جرمنی کے انقلاب کی اذان دی اور مارکس کی پیشین گوئی پوری ہو کر رہی۔ لوئی فلپ شاہ فرانس پیرس سے بھیس بدلکر بھاگ گیا اور ایم گورنمنٹ، جس نے مارکس کو جلاوطن کیا تھا، خود دوسرے ملکوں میں جان بچاتا اور پناہ تلاش کرتا پھرا۔

پروشیا کی حکومت کی مسلسل کوشش جاری تھی کہ مارکس کو بلجیم سے بھی نکلوا دیا جائے، اگرچہ شروع شروع میں یہ کوشش بے نتیجہ ثابت ہوئی، مگر فروری ۱۸۴۸ء میں جب بلجیم کے مزدوروں میں اشتراکی اور انقلابی خیالات پھیلنے لگے تو حکومت بلجیم نے مارکس کو گرفتار کر لیا اور پھر جلاوطن کر دیا۔

مارکس کی روانگی پیرس کو

چونکہ انقلاب نے فرانس کی حالت بدل دی تھی، اور جور و استبداد باقی نہیں رہا تھا، اس لئے مارکس سیدھا پیرس پہونچا۔ دراصل فرانس کی جمہوری حکومت نے اپنے ایک مخبر کی معرفت مارکس کو "بہادر اور مخلص" کہہ کر فرانس واپس بلایا تھا جہاں ظلم و استبداد کا مجسمہ پاش پاش کیا جا چکا تھا، اور کارل مارکس بھی دوسروں کی طرح آزادی اور مساوات حاصل کرنے کی مبارک جنگ میں شریک ہو سکتا تھا۔ مارکس نے چند مہینہ فرانس میں قیام کیا اور پھر جرمنی چلا گیا۔

جرمنی کی طرف روانگی اور اخبار کا اجراء

مارکس اور انجلز ۱۸۴۸ء میں کولون (Cologne) گئے اور وہاں پہونچکر انہوں نے ایک روزانہ اخبار "صدائے دیماقریطی" (An organ of Democracy) نکالا۔ مارکس، اس کا رئیس التحریر تھا، اخبار کی پالیسی انتہا درجہ کی انقلاب پسند تھی، یہ اخبار خاص طور پر حکام اور متوسط درجہ کی جماعتوں کے خلاف تھا۔

گرفتاری

۱۸۴۸ء میں جب قومی مجلس (National Assembly) برخاست کر دی گئی، تو مارکس نے پبلک کو ٹیکس ادا نہ کرنے کی تلقین کی، اور حکومت کے جبر کے خلاف اسلحہ استعمال کرنے اور مسلح مقابلہ کی تجویز پیش کی۔ محاصرہ کی ترکیبیں اخبار میں شائع کیں، آخر کار مارکس کو "سیاسی مفسد" کہہ کر بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ ۷ فروری ۱۸۴۹ء کو اس کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ مارکس نے اپنی طرف سے کوئی وکیل پیش نہیں کیا اور تقریباً ایک گھنٹہ تک تقریر کی، اس کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

"نہ صرف جرمنی بلکہ تمام پروشیا کی حالت خراب و خستہ ہے، ہم میں سے ہر ایک متنفس کا یہ فرض ہے کہ گورنمنٹ کی ہر ادنی سے ادنی حرکت کا غور سے مطالعہ کرے، اس پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کرے اور گورنمنٹ کی ذرا سی غلطی کا بھی پبلک پر اچھی طرح اظہار کر دے ...... صرف جون ہی کے مہینہ میں ہمیں تین ناجائز گرفتاریوں پر لعنت ملامت کرنی پڑی، یہ مطابع کے فرائض میں داخل ہے کہ کمزور اور مظلوموں کی طرفداری کرے، ان کی طرف سے لڑنے میں سب سے زیادہ پیش قدمی کرے، حضرات،

غلامی کی عمارت ایسی چھوٹی چھوٹی اور ادنیٰ سیاسی اور معاشرتی بنیادوں پر قایم ہے جن کا تعلق افراد کی پرائیویٹ زندگی یا خانگی معاملات سے ہے۔ اس لئے یہ علاج درست نہیں ہے کہ صرف ملک کی عام حالت اور حکومت کے اعلیٰ افسروں کے خلاف آواز بلند کی جائے بلکہ مطابع کو اس امر کا تہیہ کر لینا چاہیئے کہ وہ ہر ایک سپاہی کی، ہر ایک سر رشتہ دار کی اور ہر ایک مشیر کی مخالفت میں انتہائی کوشش کرے گا۔ کیا وجوہ تھے کہ مارچ کا انقلاب ناکامیاب ہوا؟ اس سے صرف وزرا میں کچھ اصلاح ہو گئی، مگر ادنیٰ اور متوسط طبقہ کے لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا، وہی پرانی جابر و استبدادی حکومت موجود ہے، وہی پرانی فوج ہے، وہی پرانے جج ہیں، جن کی پیدائش دور استبداد میں ہوئی، اسی کی آغوش میں انہوں نے پرورش پائی، اور اسی کی غلامی اس کی شکم پروری کا وسیلہ بنا، یہی وہ جماعت ہے جو ملک پر ظلم کر رہی ہے آج مطابع کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اس جماعت کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دے۔"

جیوری نے ملزم کو بری کر دیا، لیکن دو ہی دن بعد مارکس کو اس بنا پر پھر گرفتار کر لیا گیا کہ وہ گورنمنٹ کا مقابلہ کرنے کے لئے پبلک کو ابھار رہا ہے، مارکس کہا کرتا تھا کہ "کسی قوم کا اپنی آزادی حاصل کرنے کے لئے جو بنی نوع انسان کا فطری اور قدرتی حق ہے، گورنمنٹ کے خلاف ہتھیار اٹھانا جایز ہے۔" بہرحال اس دفعہ مارکس نے، جیوری کے سامنے نہایت زوردار تقریر کی اور جیوری نے فیصلہ کر دیا کہ "وہ بےقصور ہے" اور صرف اس پر بس نہ کر کے اپنا ایک سفیر مارکس کے پاس اس غرض سے روانہ کیا کہ وہ مارکس کے پاس جا کر جیوری کی طرف سے اس کا شکریہ ادا کرے کہ اس نے جیوری کے سامنے نہایت ہی نتیجہ خیز اور دلچسپ تقریر کی۔

جلاوطنی

مئی ۱۸۴۹ء میں جب ڈرسڈن، صوبہ رائن اور دیگر مقامات میں بغاوتیں شروع ہوئیں، تو مارکس کو پھر گرفتار کر لیا گیا، اخبار کو جبراً بند کرا دیا گیا جس کا آخری پرچہ ۱۹ مئی کو سرخ روشنائی سے چھپا ہوا شائع ہوا تھا اور جس میں "الوداع" کے عنوان سے ایک پرجوش نظم تھی۔ بالآخر حکومت نے مارکس کو پھر جلاوطن ہو جانے کا حکم سنایا۔

پیرس کو روانگی اور جلاوطنی

مارکس پیرس کو روانہ ہوا، یوں تو وہ اول ہی سے مفلوک تھا، مگر اس واقعہ کے بعد سے اس پر مفلسی اور مصیبتوں کا شدید زمانہ شروع ہو گیا۔ اس کی بیوی نے ایک جگہ اپنی ڈائری میں لکھا ہے:۔

"ہم پیرس میں قریب قریب ایک ماہ تک رہے، یہاں ہمارے رہنے کے لئے کوئی آرام دہ مکان نہ تھا، ایک دن صبح کے وقت ایک سارجنٹ معہ اس حکمنامہ کے وارد ہوا کہ کرل اور اس کی بیوی چوبیس گھنٹہ کے اندر اندر پیرس چھوڑ کر ملک سے باہر چلے جائیں" میں نے اپنا سامان باندھنا شروع کیا اور لندن کی طیاری کر دی۔ کرل ہم سے بھی پہلے طیار ہو چکا تھا"

لندن کے حالات

ان حالات وکوائف کے ساتھ مارکس جون ۱۸۴۹ء میں لندن وارد ہوا، جولائی کے مہینہ میں مارکس کا چوتھا بچہ ہنری فرنسیا پیدا ہوا، جو ۱۸۵۲ء میں مر گیا۔ اس بچہ کی موت محض مفلسی و غریبی کی وجہ سے وقوع میں آئی۔ لندن میں ابتدائی چند سال کرل نے نہایت مصیبت و انتہا درجہ کی عسرت میں گذارے، بسا اوقات ایسا ہوا کہ صداقت و خلوص کے اس فدائی خانوادہ کو صرف سوکھی روٹی کھانی پڑی اور وہ بھی چونکہ کافی نہیں ہوتی تھی اس لئے مارکس بچوں کی خاطر کہ وہ بھوکے نہ رہ جائیں خود نہیں کھایا کرتا تھا۔ اس کی معاش کا انحصار، مضامین کی اجرت پر تھا جو بہت قلیل ہوتی تھی۔ زندگی کی اس ناگوار کشاکش سے تنگ آ کر ایک دفعہ اس نے ریلوے میں کلرک ہونے کے لئے درخواست دی، مگر بدخط ہونے کی وجہ سے وہ بھی مسترد ہو گئی۔ قسمت کی نارسائی اسی کا نام ہے اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جرمنی کا فیلسوف عظیم اور مصنف عظیم ریلوے میں کلرک تک نہ ہو سکا۔ کچھ عرصہ بعد وہ نیویارک ٹریبون کا نامہ نگار مقرر ہو گیا جس کے معاوضہ میں اس کو فی ہفتہ پندرہ روپیہ ملتے تھے، ظاہر ہے کہ مارکس کی زندگی کس مصیبت و افلاس میں گذری، تمام خاندان دو کمروں میں رہا کرتا تھا، ایک سونے کا تھا اور دوسرا باورچی خانہ، ملاقات اور مطالعہ کا تھا جو لوگ مارکس سے سیاسی و تمدنی معاملات پر رائے لینے کو آتے، وہ اس کو ایسی حالت میں دیکھ کر ششدر و حیران رہ جاتے تھے۔

۱۸۵۲ء کی ابتدا میں مارکس کی لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ مارکس اس وقت انتہائی فلاکت کی حالت میں تھا، جنازہ مکان میں پڑا تھا اور تجہیز و تکفین کے لئے اس کے پاس ایک پیسہ تک نہ تھا۔ وہ اپنے ایک جرمن دوست سے قرض مانگنے گیا مگر اتفاق دیکھئے کہ اس وقت اس کے پاس بھی کچھ نہ تھا۔ پھر اس نے اپنے ایک فرانسیسی دوست سے ضرورت بیان کی جس نے کرل کے حال پر ترس کھا کر اس کو دو پونڈ دئے، جس سے اس نے بچی کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔

ایک دفعہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ مارکس چاندی کے چند برتنوں کو جو اس کی بیوی کی ملکیت تھے

اور جس پر اس کا خاندانی نشان بھی کندہ تھا، کسی دلال کی معرفت گرو رکھنا چاہتا تھا، دلال نے ایسے قیمتی برتن جب مفلس شخص کے پاس دیکھے، تو اُسے شبہ پیدا ہوا اور اس نے پولیس کو اطلاع کر کے اُسے گرفتار کرانا چاہا۔ مارکس نے بڑی دقتوں سے پولیس کا اطمینان کر کے اپنا پیچھا چھڑایا، کئی دفعہ ایسا ہوا کہ جب اس نے ضرورتاً روپیہ قرض لیا تو اسے ۲۰ سے ۵۰ فیصدی تک سود دینا پڑا، اس سے ظاہر ہے کہ سرمایہ دار کیسی بے رحمی اور دنارت کے ساتھ غربا سے برتاؤ کرتے ہیں۔ مارکس نے کئی دفعہ اپنے بچوں کی قابل رحم حالت دیکھکر کسی کاروبار کا قصد کیا، لیکن اس کی بیوی نے اس کو اس سے باز رکھا کیونکہ اس کا کسی تجارت میں مصروف ہو جانا، ایک ایسی تحریک کے لئے جو دنیا سے سود و منافع کو مٹا دینا چاہتی ہو مضر ثابت ہوتا۔ اس کی بیوی نے اس بات پر زور دیا کہ وہ اپنی علمی زندگی کو جاری رکھے اور اس طرح اپنے مارکس کو ایک بہت بڑی غلطی سے بچا لیا۔

باوجود اس قدر افلاس کے کرل نے کبھی اپنے لیکچروں کا معاوضہ نہیں لیا اس کے یہ لیکچر اقتصادیات پر لندن کے مزدوروں کے سامنے ہوا کرتے تھے، اس نے عہد کر لیا تھا کہ وہ مزدور پیشہ جماعت سے کبھی کچھ نہ لیگا، جن کا وہ اپنے تئیں ایک ادنیٰ خادم خیال کرتا تھا۔

اسی سخت آزمایش و ابتلاء کے زمانہ میں بسمارک نے مارکس کو رشوت دینے کی ایک تجویز سوچی تاکہ وہ مارکس کی تحریک کو اس طریقہ سے تباہ کر سکے۔ لیکن اس معاملہ میں بسمارک کو مایوسی ہوئی کیونکہ مارکس اس کی چال کو سمجھ گیا تھا، اور اس نے جرمنی کے سرکاری مطبع میں ملازمت کرنے سے صاف انکار کر دیا بسمارک نے مارکس کے ایک دوست کے ساتھ بھی یہی چال چلی تھی اور کامیاب ہو گیا تھا، مگر مارکس پر اس کا یہ جادو نہ چل سکا۔ کیونکہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ ایک مستبد حکومت کے ساتھ ملکر کام کرنا خواہ کتنی ہی آزادی و خودمختاری کیوں نہ ہو کبھی ملک و قوم کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ وہ اس وقت سخت عسرت کی حالت میں تھا، مگر اس کو یہ کسی صورت میں بھی گوارا نہ تھا کہ وہ اپنی ایسی تحریک کو ذرا سا بھی نقصان پہونچا کر کسی قسم کا مالی یا ذاتی فائدہ حاصل کرے۔ غرضکہ اس طرح سے بسمارک نے پبلک کے اس لیڈر کو خرید لینے کی جو کوشش کی تھی بالکل ناکامیاب رہی۔

مارکس نے یہاں بھی کمیونسٹ (Communist) انجمن قایم کرنے کی کوشش کی اور ایک پرچہ بھی جاری کیا جس کے صرف چھ نمبر شائع ہو سکے۔ مارکس کا فرانس کے انقلاب (۱۸۴۸ء) کے متعلق

ایک بہترین مضمون اسی پرچہ میں شائع ہوا۔ اس نے چند مضامین مسئلہ مشرقیہ اور خصوصاً جنگ کریمیا کے متعلق بھی لکھے تھے۔ وہ روسی حکومت کے خلاف تھا۔ اسی سلسلہ میں اس نے مسلسل مضامین، تاریخ تدابیر سلطنت (Diplomatic History of the Empire) کے عنوان سے شائع کئے جو خاص طور پر روس کے خلاف تھے، ان مضامین کو یورکوہرٹائل (Urquhartile) کمیٹی نے ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء میں شائع کیا۔ یہ کمیٹی ڈیوڈ یورکوہرٹ (David Urquhart) کی قائم کی ہوئی تھی ۱۸۵۹ء کی جنگ فرانس و آسٹریا کے متعلق مارکس نے بہت سخت مضامین لکھے اس نے ایک طرف تو اس لڑائی کو روس کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ کہا اور دوسری طرف اُسے فرانس کی انقلابی تحریک سے منسوب کیا۔ اس نے اس سلسلہ میں اس دیماقریطی فرقہ کی بھی مخالفت کی جو اس لڑائی کو اٹلی کی آزادی کا پیش خیمہ خیال کرتا تھا، اور اس طرح آسٹریا کی کمزوری کا متمنی تھا اسی مسئلہ پر اس سے اور کرل وگٹ (Karl vogt) سے بحث چھڑ گئی، جس نے نہایت شدت کے ساتھ مارکس پر نکتہ چینی کی۔ کرل وگٹ کو یہ علم نہ تھا کہ بچھو کے بل میں انگلی ڈالنا ٹھیک نہیں، چنانچہ اسے اپنا پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا، مارکس نے ہیر وگٹ (Herr vogt) کے نام سے ایک کتاب بھی شائع کی جو عجیب وغریب اور دلچسپ معلومات سے لبریز ہے اور جدید یورپ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کے لئے نہایت دلچسپ ہے۔ مارکس نے اس میں ظاہر کیا ہے کہ وگٹ بوناپارٹین فرقہ کا ایک گماشتہ ہے، ہر چند اس کا یہ خیال بھی درست معلوم ہوتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ وگٹ نے کہاں تک ضمیر فروشی سے کام لیا ہے، اسی بحث کے سلسلے میں مارکس اور (Ferdinand Lassalle) فرڈینڈ لسیل کے مابین سخت مخالفت پیدا ہوگئی کیونکہ لسیل وگٹ کا طرفدار تھا۔

"انٹرنیشنل" کا قیام | ۱۸۶۴ء میں مارکس نے اپنے رفقا کی مدد سے ایک انجمن۔ انجمن العمال بین الاقوام (International working men's association) کے نام سے لندن میں قائم کی۔ یہ انجمن اس قدر مشہور ہوئی کہ یورپ کی تاریخ میں صرف "انٹرنیشنل" کہنے سے یہی انجمن مراد ہوتی ہے۔ اس کا سرگروہ دراصل مارکس ہی تھا۔ تمام خطبات اور اعلانات جو اس انجمن کی طرف سے شائع ہوئے تھے وہ مارکس ہی کے قلم کا نتیجہ ہوتے تھے، اور وہی مجلس میں ان کی تشریح کرکے سمجھاتا تھا۔ پہلا سال بہت اچھی طرح سے گذرا۔ یہ زمانہ مارکس کے مشاغل کا بہترین وقت تھا وہ اس میں ایک "مفسد" کی

کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک "معلم" (Teacher) کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس کے خیالات، تعلیم، تجارت، اتحاد اور پابندی اوقات وغیرہ کے متعلق نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہوا کرتے تھے۔ تجاویز بہت غور و تامل کے ساتھ طیار کرتا تھا اور صرف وہی تجاویز پیش کرتا تھا جو عملی جامہ اختیار کر سکتی ہیں، لیکن یہ حالت بہت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہی، چھ سات سال تک اس انجمن نے یورپ کی سیاست پر بہت کچھ اثر ڈالا۔ میزنی (Mazzini) اٹلی کے مزدوروں کا نمایندہ تھا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ اس سے علیحدہ ہوگیا۔ کیونکہ اس کو انجمن کے تمام اصول اور طریقوں سے اتفاق نہ تھا۔ اس انجمن کے بہت سے لیڈر مختلف گورنمنٹوں نے گرفتار کر کے نظر بند کردئے مگر اس کا اثر دن بدن زیادہ ہوتا گیا لیکن میکائیل بیکونین (Meachile Bakunine) (جو روس کا بہت بڑا انقلابی لیڈر اور آزادی کا حامی تھا) کی مخالفانہ سرگرمیوں، اصولی اختلافات، فرانس اور جرمنی کی جنگ اور فرانس کے کمیونسٹ (communists) طبقہ کی سرگرمیوں نے انٹرنیشنل (بین الاقوامی) کی اہمیت کو کم کردیا اور ستمبر ۱۸۷۲ء میں ہیگ کانفرنس میں اس کا مرکزی دفتر لندن سے نیویارک تبدیل کردیا گیا۔ لیکن یہ ایک عارضی تبدیلی تھی، جولائی ۱۸۷۶ء میں فلاڈلفیا (Philadelphia) کانفرنس کے موقع پر انجمن بند کردی گئی، تاہم اس کی روح فنا نہ ہوسکی، چنانچہ واقعات مابعد نے یہ ثابت کردیا کہ ہر ملک میں اشتراکی تحریک روز افزوں ترقی پاتی گئی۔

اخیر حصہ زندگی اور وفات

انٹرنیشنل کے بند ہو جانے سے مارکس نے اپنی تمام توجہ حکیمانہ اور علمی تحقیقات میں صرف کرنی شروع کردی کیونکہ اس کو اب علمی مصروفیتوں کے لئے کافی موقع مل گیا تھا۔ مارکس کی علمی خدمات بہت زیادہ ہیں، اُس نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف رسائل، ضخیم کتابیں، اعلانات اور خطوط وقتاً فوقتاً شائع کئے۔ اس کی بعض تصانیف محض منطقی دلائل پر مبنی ہیں اور خاص طور پر اس کے مخالفین کے جواب میں لکھی گئی ہیں، بعض تصانیف ان میں سے ایسی ہیں جو اس کی تصنیف کہلانے کے قابل نہیں مثلاً اس کی کتاب قیمت تخمین و منافع (value, price and profit) مگر اس کے برخلاف اس کی بیشتر تصانیف بہت جامع اور مبسوط ہیں جو پُر از معلومات ہیں جیسے "ایک ناقد اقتصادیات" (A critic of political economy) جس کی وجہ سے مارکس کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی، اس کی زندگی کی آخری تصنیف کا نام "سرمایہ" ہے۔ یورپ

ہیں۔ اس کو عام طور سے "اشتراکیت کی انجیل" کہتے ہیں۔ اس کی تین جلدیں ہیں اور پہلی جلد وہ اپنی زندگی میں ہی شائع کر چکا تھا۔ اس نے اپنی اس تصنیف کے لئے بہت زیادہ محنت کے ساتھ مطالعہ کیا تھا، لیکن کمزوری و ناتوانی اور علالت کی وجہ سے وہ اس کام کو خود انجام نہ دے سکا، باقی جلدیں اسکے شاگرد رشید، رفیق اور فدائی فریڈرک انجلز نے اس کے مسودات سے مرتب کر کے شائع کیں، اشتراکیت کی تاریخ میں مارکس کی فریڈرک انجلز سے دوستی بھی ایک بہت بڑا واقعہ ہے، اس کی دوستی نے مارکس کو ادائی مصارف کی جانب سے بے فکر کر دیا تھا، مارکس کو اس کتاب کے خود مکمل نہ کر سکنے کی حسرت رہ گئی۔

دسمبر ۱۸۸۱ء میں اس کی بیوی کا انتقال ہوا اور اس کے پندرہ ماہ بعد ۱۶ مارچ ۱۸۸۳ء میں مارکس کی ہستی بھی دُنیا سے اُٹھ گئی۔

زندگی کے آخری تیرہ سال میں بیماریوں نے اُسے ہمیشہ گھیر رکھا، کام کی کثرت، نقص غذا انتشار و تفکرات، محنت دماغی، خرابی جگر اور بیداری شب نے اس کی جسمانی حالت وصحت کو بالکل تباہ کر دیا تھا۔ دراصل صحت کی خرابی، ذہانت کی سزا ہے، روسیو، ڈارون، ہربرٹ اسپنسر، کومٹ اور دیگر حکماء کی صحت تمام عمر خراب رہی، مارکس اس سے کس طرح مستثنٰی ہو سکتا تھا، کارل مارکس ہائی گیٹ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اس کی بیوی بھی یہیں مدفون تھی۔ چند سال ہوئے کہ ایک مجسمہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اسکے متعلق اسکے ایک شاگرد نے جو کچھ لکھا وہ بالکل درست ہے۔

اس نے لکھا ہے کہ:-

"مارکس کا مجسمہ موجود ہے، مگر نہ تو وہ کوئی کانسہ کی ڈھلی ہوئی صورت ہے اور نہ کوئی پتھر کی تراشی ہوئی مورت، بلکہ اس کا مجسمہ انسانوں کے دلوں میں ہے، دُنیا کی اشتراکی تحریک اس کا مجسمہ ہے، جس کی شان وشوکت، اشتراکیت کی ہر فتح سے بڑھتی رہتی ہے۔"

غور کرنے سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ موجودہ بولشویک تحریک اگر مارکس ہی کی پیدا کردہ نہیں ہے، تو اسکی تعلیمات سے اسمیں ایک نئی روح ضرور پیدا ہو گئی ہے۔

ن۔ ا۔ قریشی

ناسزا جوانی

خوشا، وہ دن کہ شادابی تھی دل میں جب لڑکپن کی
کیا کرتا تھا وہ بھی سیر میرے ساتھ گلشن کی

گھٹا گھِر کر جب آتی تھی، میں اسکے گیت سُنتا تھا
چمن میں گوندھتا تھا ہار میں، وہ پھول چُنتا تھا

ہم اکثر جھیل میں جس وقت چوپائے اُترتے تھے
گھنے پیڑوں کے ٹھنڈے سایہ میں آرام کرتے تھے

صدائیں دلفریب آتی تھیں چڑیوں کے بسیرے سے
نکلجاتے تھے ہم گلگشت کرنے منہ اندھیرے سے

نہایت لطف آتا تھا خنک جاڑوں کی راتوں میں
انگیٹھی کے کنارے صبح ہوجاتی تھی باتوں میں

وہ ہنستا تھا، ہوا میں دوڑتی تھی روح نرمی کی
وہ سناٹا، وہ ٹھنڈی چاندنی، راتیں وہ گرمی کی

گلوں پر ناز سے وہ جھومتا چلتا تھا کیاری میں
کہ جھولا جھولتا تھا سایہ ابرِ بہاری میں

زمیں سے چاند جب آہستہ آہستہ نکلتا تھا
مرے شانہ پر رکھکر ہات وہ پہروں ٹہلتا تھا

ہوائے سرد کے جھونکے ہمیں پنکھو دہاتے تھے
فرشتوں کی طرح شفاف چشموں پر نہاتے تھے

خوشی کا دور تھا، سرشار تھے جام تلطف سے
جھجک سے بے خبر، آزاد تھے قیدِ تکلف سے

نہ دن کو دل دھڑکتا تھا، نہ شب کو آنکھ روتی تھی
محبت تھی مگر دونوں کو اس کی حِس نہوتی تھی

کسے معلوم تھا اک روز ہوگی سرگرانی بھی
دبے پاؤں چلی آتی ہے تیزی سے جوانی بھی

زمیں ہلتی رہی، ذرات میں ہوتی رہی گردش
نہ جانے کس طرح جذبات میں ہوتی رہی گردش

بھرے ظالم کے شانے کشتیِ طفلی کے کھینے سے
کلی کھلتی گئی بالیدگی کی سانس لینے سے

جلا پردے ہی پردے میں ہوئی زلفِ پریشاں پر
زمرد کے ورق چڑھتے رہے رخسارِ تاباں پر

لبوں کو پرتوِ انوار سے دھوتی رہی بجلی
نظر میں اس کی رفتہ رفتہ حل ہوتی رہی بجلی

تغیر یہ ہوا کچھ اس طرح خاموش سرعت سے
کہ جب پردے ہٹے، آنکھوں نے دیکھا سخت حیرت سے

اک آنسو تھا سرمژگاں کہ بچپن کا زمانہ تھا
تبسم برق کا تھا، خواب کی لے کا ترانہ تھا

نقاب اُلٹی ہوئی ہے، رونقِ محفل کا جلوہ ہے
نظر اب جو اٹھی، دیکھا کہ اک قاتل کا جلوہ ہے

چٹانیں بہ رہی ہیں، سینۂ آہن میں نرمی ہے
برابر عرش سے تا فرش ہر ذرہ میں گرمی ہے

مرے سینہ کے ہر گوشہ سے شورِ الاماں اُٹھا
جگر میں آگ بھڑکی اور رگ رگ سے دھواں اُٹھا

سکت جاتی رہی اعضا رسنے، سر چکرا گیا میرا
وہ دل میں درد اٹھا، ہر رونگٹا تھرّا گیا میرا

بڑھا وہ سوزِ غم ہونٹوں پہ گویا کھنچ کے دم آیا
معاً آنکھوں میں اشکِ اولینِ سوزِ غم آیا

نظر آیا کوئی شمعیں لئے پہلے تو آنسو میں
یکایک کھل گیا پھر ایک دروازہ سا پہلو میں

حریمِ دل کی میری چشمِ گریاں نے زیارت کی
نظر آئی مجھے ہنستی ہوئی دیوی محبت کی

تپش نے حسن کی، اُف ہڈیوں تک کو گلا ڈالا
زباں سے یہ مرے بیساختہ نکلا "جلا ڈالا"

یہ سنتے ہی جبینِ حسن پر پہلی شکن آئی
جلو میں سیکڑوں جلوے لئے تازہ دلہن آئی

یکایک۔ دل میں پارہ عشق کا چڑھتے ہوئے دیکھا
جب اس نے حد سے میرے درد کو بڑھتے ہوئے دیکھا

کہا کچھ زیرِ لب زلفیں ہٹا کر روئے تاباں سے
مہک دوشیزگی کی آئی ہونٹوں کے گلستاں سے

کلی ننھے سے دل کی، غم سے کمھلانے لگی گویا
جماہی کی طرح لی سانس، نیند آنے لگی گویا

"جو چھیڑو گے تو رو دیں گے" ادائیں یہ پکار اُٹھیں
تنفس میں خلل آیا، نگاہیں بار بار اٹھیں

بچا کر آنکھ دیکھا اس نے میری غیر حالت کو
ادا سے پھیر کر پلکوں پہ انگشتِ شہادت کو

نظر میں آ گئے ارمان سارے کھنچ کے سینے سے
گلابی ہو گیا کچھ اور بھی چہرہ پسینے سے

بڑھی نازک دماغی، سادہ لوحی میں کمی آئی
جبیں پر خط پڑے رنگین آنکھوں میں نمی آئی

حیا کی شمع جل اُٹھی، حریمِ دلربائی میں
گھمایا سر جھکا کر دیر تک کنگن کلائی میں

گلے پر ہمدمِ طفلی کے تیغِ خونفشاں پھیری
ذرا سا مسکرا کر سرخ ہونٹوں پر زباں پھیری

طرب کی روح تھی جو، موت ہے اب شادمانی کی
مری طفلی کی جنت بن گئی دوزخ جوانی کی

ہزاروں بند قایم ہو گئے ذخارِ دریا میں
حدیں کھنچی گئیں راحت کی لامحدود دنیا میں

بیاں اے **جوش** ہوگا حشر میں سوزِ نہانی کا
ہمارا ہات ہوگا اور گریباں نوجوانی کا

جوشؔ

ستی

ارجن سنگھ کا تعلق اک نہایت قدیم راجپوت خاندان سے تھا اور غدر سے پہلے اُن کی ریاست بندیلکھنڈ میں اک خاص امتیاز رکھتی تھی۔ جب ۱۸۵۷ء میں بدامنی پھیلی تو ارجن سنگھ کے باپ دلاور سنگھ نے بھی اس میں کافی حصہ لیا اور ایک ہزار راجپوتوں کی جماعت سے جو دلاور سنگھ کے نام پر ہر وقت جان دیدینے کے لئے آمادہ رہتی تھی، انہوں نے اپنی حدود ریاست کو بہت زیادہ وسیع کر لیا۔

ایک سال کے بعد جب ہندوستان کے تمام عناصر اپنی اپنی اصلی حالت پر آگئے اور حکومت نے اپنے دوست و دشمن کی فہرست مرتب کرنی شروع کی تو دلاور سنگھ کا نام بھی مخالفین میں لکھا گیا اور اُن کی قدیم ریاست کے حدود بھی تنگ کر کے صرف ۲۰۰ گاؤں اُن کے لئے چھوڑ دئے گئے۔ دلاور سنگھ کے لئے یہ صدمہ نہایت غیر معمولی صدمہ تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور اس کے دوسرے ہی سال ارجن سنگھ اُس کا بیٹا ریاست رام نگر کا مالک ہو گیا۔

ہر چند ریاست رام نگر کے حدود بہت تنگ ہو گئے تھے اور اس لحاظ سے اس کے محاصل بھی کم ہو گئے تھے، لیکن پھر بھی صدیوں کی بنی ہوئی ریاست تھی اور اس کے بگڑنے کے لئے بھی اک زمانہ درکار تھا جب جوان ارجن سنگھ ایک سال بعد گدی پر بیٹھا تو ساری ریاست میں گویا از سر نو جان پڑ گئی اور رام نگر کی گڈھی نے جشن و مسرت کے لئے تمام وہ طلائی اور نقرئی سامان نکال کر باہر رکھ دیا، جو پشتوں سے اس حکمراں خاندان کی یادگار چلا آتا تھا۔

گڈھی کے بلند دروازہ پر موسیقی، شہنائیوں کی نرم و شیریں آواز کے ذریعہ سے اپنی مبارکباد پیش کر رہی تھی، دروازہ کے سامنے کی سڑک پر دورویہ سواروں کی صفیں جن کے گھوڑے اپنے زرین ساز و یراق کو دیکھ دیکھ کر مسرت سے لبریز اور بیقرار نظر آتے تھے، اچھی ہوئی تھیں، سواروں کے بانکے صافے، چست پاجامے، اچھی ہوئی چکنیں، پہلو میں لگی ہوئی آبدار کٹاریں۔ گلے میں حمائل کی ہوئی تلواریں، بل کھائی ہوئی مونچھیں، کانوں سے بندھی ہوئی ڈاڑھیاں، اور پھر اُن کے وہ کڑے تیور جو اک راجپوت سے کبھی جدا نہیں ہوتے عجیب سماں پیش کر رہے تھے۔

سواروں سے ذرا پیچھے ہٹ کر ہاتھیوں کی صفیں تھیں، جن کے مرصع جھول، زرکار ہودے، صبح کی روشنی میں جگمگا رہے تھے، سنگوٹیاں چڑھے ہوئے دانت، رنگین کی ہوئی مستکیں، جن پر مہاوت سرخ وردیاں پہنے ہوئے اپنے آنکس چمکا رہے تھے، ماہی مراتب کا جلوس، اس کا طلائی و نقرئی سامان بینڈ والوں کا دستہ، گڈھی کے اندر دروازوں کے سامنے سرداروں کا ہجوم، چوبداروں کی قطار، جوان جوان مہریوں کی آمد و رفت بھاٹوں کی رجز خوانی، غرض اس سے عبارت تھا وہ جشن جس نے ارجن سنگھ کی تقریب تخت نشینی پر ساری ریاست کو پر رونق بنا رکھا تھا۔

محل کے اندر سنگ مرمر کے ایک چبوترہ پر نہایت قیمتی کارچوب کی مسند بچھی ہوئی ہے، سبز مخمل کا تکیہ جو زرین کام سے بالکل لپا ہوا ہے قرینہ سے کنارے رکھا ہوا ہے اور راجپوت خاندان کی دو نوجوان لڑکیاں ہاتھوں میں چنور لئے ہوئے کھڑی ہیں، چبوترے کے دونوں طرف رنواس کی عورتیں، طلائی اور نقرئی پیالیوں میں صندل، سیندور، پسی ہوئی ہلدی، چاول وغیرہ لئے کھڑی ہیں تاکہ مہاراجہ کی پیشانی پر تلک لگا کر گدی نشینی کی رسم کو پورا کریں۔

ارجن سنگھ کی شادی ریاست رام نگر کے ایک معزز راجپوت سردار کی لڑکی سے ہو چکی تھی، اور حقیقت یہ ہے کہ ارجن سنگھ جن خوبیوں کا رئیس تھا، انہیں صفات کی رانی بھی اسے ملی تھی اور یہی سبب تھا کہ اگر گڈھی سے باہر جشن و مسرت کا ہنگامہ بپا تھا، تو گڈھی کے اندر بھی رانی سندر پتی کی داد و دہش عالی حوصلگی، فیاضی اور خوش اخلاقی نے دھوم مچا رکھی تھی۔

ارجن سنگھ ابھی حمام ہی میں تھا کہ گڈھی کے دروازے پر ایک سوار دوڑا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ راجہ رن بیر سنگھ کی سواری، جسے جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی، قریب آ گئی ہے، اس کی خبر ہوتے ہی اندر سے لیکر باہر تک اک ہنگامہ برپا ہو گیا، ایک ہلچل مچ گئی، بینڈ شروع ہو گیا، نفیریاں چیخنے لگیں، شہنائیاں زور زور سے بجنے لگیں، نوبت، نقارے، ڈھونسے بجنے لگے، مہریاں جلدی جلدی اندر سے باہر باہر سے اندر آنے جانے لگیں، نقیب آوازیں لگا رہے تھے، چوبدار اپنے عصا چمکا رہے تھے، بھاٹ کبت پڑھ رہے تھے کہ راجہ رن بیر سنگھ، فوج کی سلامی لیتے ہوئے، سرداروں کے استقبال میں اپنے گھوڑے پر سوار پھاٹک پر پہونچ گئے اور مجانے، پالکیاں، فینسیں، دروازہ پر لگ گئیں، جن سے سبل گڈھ کی رانیاں اور لڑکیاں اتر اتر کر قلعہ میں داخل ہو گئیں۔

(۲)

دلاور سنگھ نے اپنے بعد تین اولادیں چھوڑیں تھیں۔ ان میں سب سے بڑا بیٹا ارجن سنگھ (ولی عہد) تھا دوسرا رنجور سنگھ جس کی عمر بیس سال کی تھی اور ایک بیٹی شیام کنور جو رنجور سنگھ سے دو سال چھوٹی تھی۔

اگر ارجن سنگھ سے اس کی رعایا کو صرف محبت تھی تو وہ رنجور سنگھ کی پوجا کرتی تھی، کیونکہ ارجن سنگھ نے تمام انتظام اسی کے سپرد کر دیا تھا اور یہ اپنے بھائی کی حد درجہ عظمت کرتے ہوئے اپنا تمام وقت رعایا کی دلدہی میں صرف کیا کرتا تھا۔ اسی طرح محل کے اندر کا انتظام رانی سندر پتی نے اپنی نند شیام کنور کے سپرد کر دیا تھا، جو بے انتہا ہوشیار منتظم اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔

ریاست سبل گڈھ اور ریاست رام نگر میں بہت ارتباط تھا اور بارہا ایسا ہوا کہ دونوں ریاستوں نے متفقہ طور پر دشمن کا مقابلہ کیا اور بڑی سے بڑی فوج کا منہ پھیر دیا۔ راجہ رتن بیر سنگھ یوں تو بہت سی کنبہ کی لڑکیاں رکھتا تھا لیکن اولاد کی طرف سے بدقسمت تھا اور سات لڑکوں، چار لڑکیوں میں سے صرف ایک لڑکی سوشلا زندہ رہی جس کی عمر اس وقت اٹھارہ سال کی تھی اور جو اپنی فہم و تمیز، صورت شکل کے لحاظ سے بندیلکھنڈ کے تمام راجپوت خاندانوں میں وہی حکم رکھتی تھی، جیسے کسی چمن میں گلاب کا وہ پھول جو سب سے اونچی ٹہنی پر کھلا ہوا سب سے پہلے اپنی ہی طرف لوگوں کی نگاہ کھینچ لیتا ہے چونکہ ان دونوں خاندانوں میں اک زمانہ سے اتحاد قایم تھا اور عورتوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی اس لئے سوشلا اور شیام کنور میں بے انتہا ارتباط بڑھ گیا تھا اور مہینہ میں آٹھ دس روز کے لئے ان دونوں کا یکجا ہونا ضروری تھا۔ سبل گڈھ اور رام نگر میں صرف پندرہ کوس کا فصل تھا۔

(۳)

بسنت کا موسم ابھی ختم نہیں ہوا ہے، دلوں کی امنگیں بدستور باقی ہیں، بہار کی دیوی نے ہنوز اپنا سنہرا لباس نہیں اتارا ہے، کھیتوں کی رونق، باغوں کی شگفتگی ابھی تک قایم ہے، جشن کی دوسری رات کو گلبازی کی رسم رام نگر کے قلعہ میں ادا ہونے والی ہے، پھولوں کا انبار لگا ہوا ہے، محل کے اندر کوٹھوں پر چاندنی میں لڑکیوں اور عورتوں کا ہجوم مصروف نشاط ہے، نیچے شیام کنور اور سوشلا دونوں انتظام میں مصروف ہیں، فرش، چاندنیاں، قالین، تکیہ، مشعلیں، شمعیں، عطردان، گلاب پاش، بخوردان، تھالیاں، چنگیریں، گلوریاں عبیر و گلال باہر اندر بھیج رہی ہیں، مہمان آ جا رہی ہیں، بچے کھیل رہے ہیں، نوجوان لڑکیاں آپس میں ایکدوسرے کو چھیڑ رہی ہیں، ہاتھوں میں

پچکاریاں لئے ایک دوسرے پر رنگ ڈال رہی ہیں۔ اور دوڑ، دھوپ سے نازک رخساروں اور پیشانیوں پر جو قطرے پسینہ کے پیدا ہو جاتے ہیں، انہیں ایک طرف گردن جھکا کر نازک انگلی کے خم سے زمین پر گراتی جا رہی ہیں اور کوئی ان موتیوں کو چننے والا موجود نہیں ہے۔

الغرض اسی طرح اندر، باہر محل مچی ہوئی تھی، اک شور و ہنگامہ برپا تھا کہ رنجور سنگھ باہر کے انتظام سے فارغ ہونے کے بعد شیت محل کا چور دروازہ کھول کر جلدی کے خیال سے اندر داخل ہوا تا کہ اپنی بہن شیام کنور سے صبح کے اہتمام کے متعلق مشورہ کرے، وہ سمجھتا تھا کہ نیچے پردہ ہو گا اور سبل گڈھ کی رنواس اوپر ہو گی عجلت میں اطلاع کرانا بھول، سو شلا تھک کر اندر دالان میں تخت پر لیٹ گئی تھی اور ایکطرف کروٹ لیکر آنکھیں بند کئے ہوئے اپنے دکھے ہوئے اعضا اور تھکے ہوئے دماغ کو سکون پہنچا رہی تھی۔

کہ شیام کنور نے باہر کے دالان سے آواز دی "واہ سو شلا، ابھی سے تھک گئیں، ذرا ادھر تو آؤ، دیکھو پوجا کی تھال ٹھیک ہو گئی یا نہیں"۔

سو شلا جسے شیام کنور سے بڑی محبت تھی، اٹھی اور عین اسی وقت جبکہ وہ کھڑی ہو کر باہر جانے کے لئے اک آخری انگڑائی لے رہی تھی، پہلو کے دروازہ سے رنجور سنگھ نکلا اور دونوں کی نگاہیں ایک دوسری کے مقابل ہو گئیں۔

بجلی نگاہوں کے سامنے کوندتی ہے، لیکن اس طرح نہیں، برقی رو نہایت تیزی سے دوڑ جاتی ہے، لیکن اتنی سرعت کے ساتھ نہیں، دو نگاہوں کا ملنا جسموں میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے، لیکن اس شدت کے ساتھ نہیں۔ رنجور سنگھ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اک بت کی طرح وہیں دروازہ کے چوکھٹے میں جہاں سے وہ نکل رہا تھا قایم ہو گیا۔ سو شلا بدحواس ہو کر باہر نکل گئی اور فرش پر اس طرح گھبرا کر گر پڑی جیسے کوئی ہرنی شکاری کے تعاقب سے نجات پا جانے کے بعد بھی دیر تک اپنی سانس کو درست نہیں کر سکتی۔

شیام کنور یہ دیکھکر پریشان ہو گئی اور فوراً ہی اندر کے دالان میں دوڑی ہوئی گئی کہ سو شلا کے اس طرح گھبرا کر بھاگنے کا سبب معلوم کرے، لیکن وہاں کوئی نہ تھا، سو شلا سے پوچھا اس نے کہا "کچھ نہیں، صرف سر چکرانے لگا تھا"۔ شیام کنور کو اس وقت نہ زیادہ غور کرنے کی فرصت تھی نہ اصرار کی۔ اپنے کام میں لگ گئی اور سو شلا سے یہ کہہ کر کہ "تم بہت تھک گئی ہو ذرا آرام کر لو"، باہر کسی اور کام سے چلی گئی۔

رام نگر میں یہ جشن مسلسل سات دن تک قایم رہا اور ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہوئی کہ کس لطف میں اس کی یہ زندگی بسر ہوئی، گویا ہر شخص فردوس میں تھا اور اس لئے رنجور سنگھ کے دل میں سوشلا کے سانولے رنگ نے جس طرح آہستہ آہستہ آگ مشتعل کرنا شروع کی اس کا پتہ کسی کو نہ چلا، یہاں تک کہ شیام کنور بھی کوئی تغیر اپنے بھائی میں محسوس نہ کر سکی۔

آٹھویں دن جب راجہ رن بیر سنگھ رخصت ہونے لگا اور رنجور سنگھ کو یقین ہو گیا کہ اب اس کے دل کی ملکہ اس کی روح کی دیوی جس کی خاموش پرستش وہ اتنے دنوں سے کر رہا تھا زیادہ قیام نہیں کر سکتی تو اس کا دل تڑپ کر رہ گیا اور باوجود اس کے کہ وہ حد سے زیادہ ضابط و متین نوجوان تھا بے اختیار ہو کر اپنے بھائی کے پاس گیا اور پوچھا کہ "سبل گڈھ کی رنواس لے کر کون جائیگا۔؟"

راجہ ارجن سنگھ نے کہا "شمشیر سنگھ حوالدار"۔

رنجور سنگھ:۔ "کیا آپ نے اس پر غور کر لیا ہے کہ اس صورت میں جب کہ منگل گڈھ کے ٹھاکر نے سبل گڈھ کی دشمنی پر پوری طرح کمر باندھ لی ہے شمشیر سنگھ کی سپردگی میں سب کو روانہ کرنا مناسب ہے۔؟"

ارجن سنگھ:۔ "ہاں یہ صحیح ہے لیکن رن بیر سنگھ بھی تو موم کا بنا ہوا نہیں ہے اور پھر وہ سبل گڈھ سے یہاں آیا کہ نہیں"۔

رنجور سنگھ:۔ "ممکن ہے کہ دشمن نے اس وقت مناسب نہ سمجھا ہو۔ اور پھر یہ تو میزبان کا فرض ہے کہ وہ مہمان کو حفاظت کے ساتھ اس کے گھر تک پہونچا دے۔ اگر خدانخواستہ راستہ میں مقابلہ ہو گیا تو رن بیر سنگھ کے پچاس سپاہی اور شمشیر سنگھ حوالدار کیا کرے گا، میری رائے میں تو کوئی اور انتظام کرنا چاہیئے"۔

ارجن سنگھ:۔ "رنجور، تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو، میں نے سارا انتظام تو تمہارے سپرد کیا ہے اور تم اس معاملہ میں مجھ سے اصرار کر رہے ہو۔ میں نے تمہارے کس انتظام میں دخل دیا ہے کہ اس معمولی سی بات میں مخالفت کروں گا، تم جو چاہو کرو، جس کو چاہو روانہ کرو"۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ شیام کنور آئی، اور اس ناز کے ساتھ جو ایک چھوٹی بہن کو اپنے بڑے بھائی پر ہوتا ہے، ارجن سنگھ سے بولی کہ "تم لوگوں کو مہمان داری کرنی خوب آتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ رنواس

کے ساتھ شمشیر سنگھ جارہا ہے۔ رنجور، کیا تمہاری عقل بھی بالکل ماری گئی۔ یوں چاہے کوئی کچھ نہ کہے، لیکن یہ تو سمجھو کہ سوشلا کے باپ اپنے جی میں کیا کہیں گے کہ بلا کر ہماری بڑی قدر کی۔ رنجور، اٹھو اور تم خود سبل گڈہ تک سب کو پہونچا کے آؤ۔"

رنجور نے اپنے بڑے بھائی کے جھک کر پاؤں چھوئے اور باہر چلا گیا۔

(۵)

رن بیر سنگھ:۔ "کنور رنجور سنگھ کل صبح جانے کی اجازت چاہتے ہیں۔"

سوشلا:۔ "مہاراج، ابھی نہ جانے دیجے، کم از کم تین دن اور ٹھیرائیے نہیں تو شیام کنور مجھے طعنہ دے گی کہ بھائی کو دو دن بھی نہ ٹھیرایا گیا۔"

رن بیر سنگھ:۔ "میں نے تو اس سے کہا تھا، لیکن وہ نہیں مانتا کچھ گھبرایا ہوا سا ہے، تمہیں کہو شاید مان جائے۔"

رن بیر سنگھ بغیر اس کے کہ وہ سوشلا کا جواب سنتا محل سے باہر چلا گیا اور چوبدار کو حکم دیا کہ کنور رنجور سنگھ کو گھر میں بھیج دے کہ سوشلا رانی (سوشلا عام طور سے اسی لقب کے ساتھ یاد کی جاتی تھی) یاد کر رہی ہیں۔

برسات کا پہلا چھینٹا، سوکھے ہوئے درخت کے لئے، ایک چشمۂ جاری دن بھر کے تھکے ہوئے پیاسے ہرن کے لئے، نوید بہار بلبل کے لئے، آم کا پھول کویل کے لئے اس قدر باعث تازگی و مسرت نہیں ہو سکتا، جس قدر ایک محبوب کا پیام کسی عاشق کے لئے جو غریب کوئی تمنا بھی پیدا نہیں کر سکتا، لیکن رنجور سنگھ یہ پیام سن کر سکتہ میں آگیا، چوبدار کی صورت تکنے لگا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اس کے بدن پر ایسا رعشہ طاری ہو گیا جیسے بید کی شاخ کو کوئی ہوا جھونکا کپکپا کے چلا جائے۔

وہ متحیر تھا کہ اس پیغام کی صداقت کو کیونکر تسلیم کرے، وہ کس طرح یقین کرے کہ سوشلا نے اُسے بلایا ہے اور اگر بلایا ہے تو کیوں؟

سبل گڈہ کی گڈھی کے سب سے بالائی حصہ میں دالان کے دروازہ پر زربفت کے پردے پڑے ہوئے ہیں سامنے رنجور سنگھ ایک صندلی چوکی پر اس طرح بیٹھا ہوا ہے، جیسے کسی مجرم کو اس کی سزا کا حکم سنایا جانے والا ہو۔ اس کو آئے ہوئے پانچ منٹ سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے کہ اس نے سینکڑوں دنیائیں بنا بنا کر بگاڑ ڈالیں، اس نے خدا جانے کیسے کیسے عالیشان قصر تعمیر کر کر کے ڈھا دئے اور کسے خبر ہے کہ کتنی

ارزوؤں کا حشر اس کے سینہ میں بپا ہو ہو کر رہ گیا۔ وہ بائیں ہاتھ پر اپنے مضمحل اور سوگوار سر کو رکھے ہوئے تلوار کے قبضہ کو جو اس کے سامنے رکھی ہوئی تھی، انہماک کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ پردہ کو جنبش ہوئی اور پردہ کو کیا جنبش ہوئی اس کی روح کو جنبش ہوئی، یہ کپکپانے لگا، ہاتھ پاؤں کانپنے لگے، آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور وہی منظر سامنے آ گیا، جب رام نگر میں اس نے اول اول سوشلا کو دیکھا تھا۔

سوشلا:۔ "کنور صاحب، آپ کیا ہم لوگوں سے خفا ہیں"؟

اس وقت تک رنجور سنگھ سوچ رہا تھا کہ جب اس سے کوئی سوال کیا جائے گا تو وہ حد درجہ نرمی اور تہذیب کے ساتھ جواب دے گا۔ لیکن جب وہ وقت آیا، جب اس کے صبر و ضبط کے امتحان کی ساعت آئی تو وہ سخت ناکامیاب ثابت ہوا اور نہایت ہی اضطراب کے ساتھ چونک کر صرف یہ جواب دے سکا کہ "نہیں تو کون کہتا ہے"؟

رنجور سنگھ کی حالت اس وقت اس قدر عجیب و غریب تھی کہ سوشلا جو پردہ کی اوٹ سے اس کو دیکھ رہی تھی، ضبط نہ کر سکی اور بے اختیار ہنس پڑی۔ وہ اول ہی دن سمجھ گئی تھی کہ رنجور سنگھ کا دل پوری طرح مجروح ہو چکا ہے لیکن اس وقت وہ یقین کی اس حد تک پہونچ گئی تھی، جب تیر چلانے والے کو بھی اپنے شکار پر رحم آ جاتا ہے اور اس کی تڑپ سے لذت کے بجائے اُسے آزار پہونچنے لگتا ہے۔

رنجور سنگھ نے بھی ہنسی کی اس آواز کو، آبشار کے اس ہلکے سے ترنم کو، بلبل کو اس لحن دلنواز کو اور "موج کوثر و تسنیم" کی اس نازک سی صدا کو سُنا اور ایسا محسوس کرنے لگا کہ اب اس کا سینہ جذبات کی فراوانی سے پھٹا جا رہا ہے، گریۂ بے اختیار اُمنڈ اُمنڈ کر اس کی آنکھوں میں آ رہا ہے اور وہ سوشلا کے قدموں پر گر کے پھوٹ پھوٹ کر رو دینا چاہتا ہے، لیکن اس نے ضبط کیا۔ وہ ضبط جو سینے سے دھواں بلند کر دیتا ہے جو آنکھوں سے خون ٹپکا دیتا ہے اور جو قلب کو شق کر کے کلیجہ کو مُنہ تک لے آتا ہے۔

رنجور سنگھ کا سر چکرایا، تلوار اس کی آغوش سے نیچے گر گئی، صندلی میں جنبش پیدا ہوئی اور رام نگر کا وہ نوجوان جس نے اس وقت تک تلواروں کی چھاؤں میں پرورش پائی تھی، اک لڑکی کے سامنے اس طرح غش کھا کر گر پڑا جیسے ارنڈ کے خشک درخت کو ہوا کا جھونکا زمین پر گرا جاتا ہے۔

چاہیئے تھا کہ سوشلا اس منظر کو دیکھ کر گھبرا جاتی، چیخ مار کر بھاگ جاتی، لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی

یہ تدبیر نہیں ہے، وہ سمجھتی تھی کہ جس نے آگ لگائی ہے اسی کو بجھانا بھی پڑے گا، اس لئے محبت کی وہ چنگاری جو اس کے دل میں بھی اس وقت تک سلگ رہی تھی دفعتہً بھڑک اٹھی، اور تمام وہ مدارج جو اک حسن کو اپنے نقاب پوش ہونے کی حالت سے لے کر بندِ حجاب وا کر دینے تک عشق کی پذیرائی میں طے کرنے پڑتے ہیں، سوشیلا نے آنِ واحد میں طے کر لئے اور بے اختیار پردہ سے باہر آ کر بے ہوش رنجور کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اپنے آنچل سے اس کو ہوا دینے لگی۔

سوشیلا ہر چند اک ناتجربہ کار لڑکی تھی، لیکن اس کے پہلو میں ایک راجپوت دل تھا، دماغ میں عزم ارادہ کی قوت تھی اس لئے جب تک اس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، وہ پس و پیش کرتی تھی کہ رنجور سنگھ کے دل کے ساتھ کیا معاملہ کرے، لیکن جب اس نے ایک بار طے کر لیا کہ وہ صرف رنجور ہی کی ہو کر رہ سکتی ہے، جب اس کی روح ایک بار اس خیال کے سامنے دو زانو ہو گئی، جب وہ اپنے اندر جذباتِ پرستش محسوس کرنے لگی جو صرف ایک ہندو عورت ہی کے اندر پائے جا سکتے ہیں، تو اس نے اپنی دنیا کو تنگ کرنا شروع کیا، دنیاوی مصالح کو نظر انداز کرنے لگی، ننگ و ناموس کے مفہوم کو وہ صرف روحانی نقطۂ نظر سے دیکھنے لگی اور آخرکار اس نے فیصلہ کر لیا کہ میری دنیا صرف رنجور کی محبت ہے اور میری مصلحت وہی ہونی چاہیئے جو اس کی دلدہی اور پرستش سے وابستہ ہے۔

اس وقت تک کہ رنجور سے اس نے سوال کیا تھا وہ شریر تھی، رنجور کی بے قراری و بدحواسی سے لطف اٹھانے کا عزم رکھتی تھی، لیکن جب رنجور نے اپنی بیہوشی سے، جو ایک عاشق کا نہایت ہی خاموش مگر کارگر حربہ ہے، جو مقاومتِ حسن کے لئے محبت کا تنہا ذریعہ کامیابی ہے، سوشیلا کے سامنے اپنی زندگی کا اک نیا ورق الٹ کر پیش کیا اور اس نے محبت کی اس دلگداز داستان کو اپنی آنکھوں سے سُن لیا، تو اس نے سمجھ لیا کہ ہم دونوں کی روحوں کو باہم فطرت نے ملا دیا ہے اور مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ اپنے جسم کو اس سے چھپاؤں جس کے سامنے میری روح عریاں ہے اور اس کا جسم چھونے سے گریز کروں، جس کی روح میرے قلب کی تمام گہرائیوں میں، میرے جسم کے تمام عروق میں خون کے ساتھ ملی ہوئی دوڑ رہی ہے۔

سوشیلا اب اس کے اوپر جھکی ہوئی اسی محبت سے دیکھ رہی ہے، جس طرح وہ اپنے شوہر کو دیکھ سکتی تھی اور اس کی پیشانی کا پسینہ اس طرح احتیاط سے اپنے رومال میں جمع کر رہی ہے جیسے کوئی بکھر جانیوالے موتیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر یکجا کرتا ہے۔ (باقی)

اسلام میں سلطنت کا مفہوم

اسلام میں پیشوائے مذہب اور بادشاہ کے فرائض ایک ہی شخص میں مجتمع تھے، محمد صلعم، خدا کے پیغمبر بھی تھے اور عربوں کے دنیاوی حکمراں بھی، آپ گویا قیصر بھی تھے اور پوپ بھی۔ اسلامی سلطنت کی یہ ہیئت آج تک چلی آتی ہے، اگرچہ اس کے اندر اہم تغیرات ہوتے رہے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید پہلے سے یہ اصول مرتب کر لئے گئے ہوں گے اور ان کے مطابق اسلام کا نظام حکومت قائم کیا گیا ہوگا، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، کیونکہ جو واقعات رونما ہوتے تھے، انہیں کے مطابق اصول بھی مرتب ہوتے جاتے تھے۔ البتہ خاندان بنی عباس کے عروج سے نظریات و قیاسات کے زمانہ کا آغاز ہوتا ہے، کیونکہ اس دور حکومت میں خلافت کے نظام تمدن و سیاست میں خارجی اثرات کا رنگ نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔

ہم یہاں اسلام کے نقطۂ نظر سے سلطنت کے مفہوم پر بحث کرنا چاہتے ہیں، لیکن محض سیاسی نظریات کا بیان کرنا اور ان واقعات کا حوالہ نہ دینا جن سے وہ معرض ظہور میں آئے ہیں مفید نہیں ہو سکتا، اسلئے نظریۂ سلطنت پر تاریخ خلافت کی روشنی میں بحث کرنا ضروری ہے۔

خلافت کی تاریخ تین غیر مساوی حصوں میں تقسیم کیجا سکتی ہے، جن میں سے ہر ایک کی خصوصیات جداگانہ ہیں:۔

(۱) خلافت راشدہ (۲) خلافت بنی امیہ یا حکومت امرائے عرب (۳) دور بنی عباس یا بالفاظ دیگر حکومت عجم۔

خلفائے راشدین دینی و دنیاوی معاملات میں رسول اللہ کے حقیقی جانشین تھے اور راہ اسلام میں اپنی مخلصانہ جاں نثاری اور وفاشعاری کی وجہ سے منصب خلافت کے بجا طور پر مستحق تھے۔ ان کے نزدیک اسلام سے بڑھ کر کوئی چیز اعلیٰ اور دلچسپ نہ تھی، وہ اغراض اسلام میں ہمہ تن منہمک رہتے تھے اور بجز اشاعت اسلام کے اور کوئی غرض و غایت ان کے پیش نظر نہ تھی، مسئلہ جانشینی ہر چند اس وقت بھی شد و مد کے ساتھ معرض بحث میں رہتا تھا لیکن اس نے کبھی وہ اہمیت اختیار نہ کی جو خلافت مابعد

کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔

آنحضرت کی وفات کے بعد اسلام کے تباہ ہو جانے کا فوری خطرہ تھا اور پہلا سوال یہ پیش ہوا کہ آپ کا جانشین کون قرار دیا جائے، اور اس روز افزوں جماعتِ اسلامی کا مقتدا کس کو بنایا جائے۔ اس باب میں لوگ مختلف الرائے تھے اور خصوصیت کے ساتھ مہاجرین و انصار کسی ایک شخص کے لئے متفق نہ ہوتے تھے۔ اس لئے یہ تجویز کی گئی کہ ہر ایک اپنا اپنا سردار منتخب کر لے، لیکن حضرت عمرؓ نے جو دوراندیش مزاج شخص تھے اور رسول اللہؐ کے بعد جن کے احسانات اسلام پر بہت ہیں حضرت ابوبکرؓ کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے اس معاملہ کا فیصلہ کر دیا۔

حضرت ابوبکر آنحضرت صلعم کے خسر اور نہایت معتمد علیہ مشیر تھے، اس انتخاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ کے بعد جو اضطراب جماعتِ اسلام میں پیدا ہو گیا تھا مٹ گیا۔

اس انتخاب کے متعلق یہاں دو باتوں کا ذکر کر دینا ضروری ہے ایک تو یہ کہ اسلامی جماعت حضرت ابوبکر کو ہرگز خلیفہ منتخب نہ کرتی۔ اگر وراثت کا ذرا بھی خیال کیا جاتا، کیونکہ اس لحاظ سے حضرت علیؓ سے زیادہ کوئی شخص خلافت کا استحقاق نہ رکھتا تھا، جو جناب فاطمہؓ کے شوہر رسول اللہ کے خویش اور برادر عم زاد تھے، دوسرے یہ کہ حضرت ابوبکر کا خلیفہ ہونا اس وقت تک تسلیم نہیں کیا گیا جب تک دوسرے روز اجماعِ امت سے اس کی تصدیق عمل میں نہ آگئی۔

یہاں پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے جو یہ طریقہ اختیار کیا تھا، تو کیا اس باب میں کوئی اصول اُن کے پیشِ نظر تھا۔ یا کوئی نظیر موجود تھی یا یہ کہ انہوں نے محض اس خیال سے کہ مسلمانوں میں نزاع یا تفریق پیدا نہ ہو ایسا کیا۔ عربوں کی تاریخ قبل اسلام اس سوال کا جواب نہایت آسانی سے دے سکتی ہے۔ اہلِ عرب زمانۂ قدیم میں بھی اس کو روا نہ رکھتے تھے کہ کوئی مستبد فرمانروا خواہ وہ اہلِ عرب میں سے ہو یا غیر عرب میں سے اُن پر حکمرانی کرے۔ اور ہر چند عرب کے بعض حصے اہلِ روما کی عملداری یا ایرانی حکومت کے زیرِ اثر آگئے تھے لیکن حجاز نے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے اور جو اسلام کا گہوارہ تھا، کبھی کسی کی اطاعت نہیں کی تھی۔

اہلِ عرب جو مختلف قبائل میں منقسم تھے اپنے سردار قبیلہ کے سوا کبھی کسی اور کا حکم نہ مانتے تھے اور ان سرداروں کا انتخاب بھی اہلِ قبیلہ کی رائے پر منحصر ہوا کرتا تھا۔ جس میں وہ عمر اور شرافتِ خاندانی کو زیادہ

ملحوظ رکھتے تھے۔ لہذا یہ سمجھنا بیجا نہ ہوگا کہ حضرت ابو بکر کو بطور خلیفہ پیش کرنے میں، حضرت عمر نے بھی اصول پر عمل کیا جو عربوں میں پہلے سے رائج تھا۔ حضرت ابو بکر، عمر کے لحاظ سے مسلمانوں میں سب سے بڑے اور شرافت کے لحاظ سے نہایت معزز تھے۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ کی جانشینی حضرت ابو بکر کی نامزدگی سے عمل میں آئی اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کا تصفیہ حضرت عمر کے مقرر کردہ پنچ نے کیا۔

جب حضرت عمر کے مہلک زخم لگا تو آپ کا اسی وقت انتقال نہیں ہوا بلکہ آپ کو اپنے جانشین کے تقرر کا انتظام کرنے کے لئے کافی فرصت مل گئی۔ چنانچہ آپ نے آنحضرت صلعم کے مشہور صحابہ کی ایک مجلس شوریٰ مقرر کی جو حضرت علی، حضرت عثمان، زبیر، طلحہ، سعد، و عبدالرحمن بن عوف پر مشتمل تھی۔ ان میں آپ کے فرزند عبداللہ بھی شامل تھے، مگر ان کو محض شریک شوریٰ ہونے کا حکم تھا، آپ نے صاف طور پر ارشاد فرمایا تھا کہ عبداللہ بصورت مساوی ہونے رایوں کے اپنی آخری رائے دیگا۔ لیکن وہ ہرگز خلافت کا امیدوار نہ ہوگا۔ یہ واقعہ اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ موروثی سلطنت کا خیال اس وقت بالکل پایا جاتا تھا اور نہ ایسا ہو سکتا تھا، کیونکہ یہ امر عربوں کے موروثی روایات کے خلاف تھا۔ حضرت علی سب سے آخر میں خلیفہ منتخب ہوئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ موروثی جانشینی کا خیال اسوقت تک بالکل رائج نہ تھا اور عرب اس سے بالکل ناآشنا تھے۔

ہرچند امیر معاویہ کے زمانہ میں ابتداءً خلافت کو موروثی بنانے کی کوشش کی گئی، مگر قدیم اصول انتخاب نے عربوں میں ایسی مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ لی تھی کہ بنو امیہ باوجودیکہ ان کو بڑے بڑے اختیارات حاصل تھے اس کو بالکل نظرانداز نہ کر سکے، خلافت کو موروثی بنانے کی تجویز سب سے پہلے معاویہ کے سامنے المغیرہ ابن شعبہ نے پیش کی تھی اور اسی مشورہ کی بنا پر امیر معاویہ نے اپنی زندگی ہی میں یزید اپنے بیٹے کے لئے بیعت حاصل کی۔

امیر معاویہ، خاندان بنی امیہ کے مؤسس تھے اور انہوں نے جب اول اول اپنے آپ کو بادشاہ کہا (ملاحظہ ہو الیعقوبی جلد دوم صفحہ ۲۷۶) تو سعد ابن مصعب نے تلخی سے یہ جواب دیا کہ "خدا معاویہ سے قصاص لے کہ اول اس نے مومنین کی حکومت کو سلطنت میں تبدیل کر دیا" یہاں ہم ایک روایت اور بیان کرتے ہیں جس سے بنو امیہ کی نسبت اس وقت مسلمانوں کا خیال زیادہ وضاحت کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے:۔

جب امیر معاویہ کی خلافت پر اجماعِ امت ہو چکا تو سعد ابن ابی وقاص نے آکر بحیثیت بادشاہ ان کو "سلام علیک" کہا امیر معاویہ نے مسکرا کر استفسار فرمایا "اے سعد، اگر تو امیر المومنین کا خطاب استعمال کرتا تو کیا کوئی حرج تھا" سعد نے جواب دیا "وہ آپ اس طرح مسکراتے ہوئے اس کا ذکر کرتے ہیں یقین جانیے کہ اگر یہ منصب مجھے اس طرح حاصل ہو سکتا، جس طرح آپ کو حاصل ہوا ہے، تو میں کبھی اس کو منظور نہ کرتا" اس سے ظاہر ہے کہ مسلمان خلافت کو حکمت عملی سے وابستہ کرنا پسند نہ کرتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ بنی اُمیہ نے اسلام کو مذہب سے گرا کر حربیت کے درجہ پر پہونچا دیا اور پھر وہاں سے خالص سلطنت کے مرتبہ پر۔

ہر چند بنو اُمیہ اور بنو عباس کے زمانہ میں خلافت کو موروثی بنانے کے لئے سعی بلیغ کی گئی، لیکن یہ خیال لوگوں کے دلوں میں جاگزیں نہ ہوا اور باوجود اس کے کہ اس کی تائید میں کثیر روایات موضوع کی گئیں مگر لیکن نتیجہ کچھ نہ ہوا کیونکہ یہ بات اس زمانہ کے رجحان اور لوگوں کے مذاق کے خلاف تھی۔

اس کا نہایت صاف ثبوت ہمارے پاس موجود ہے اور وہ یہ کہ خاندان بنو امیہ کے چودہ فرمانرواؤں میں سے صرف چار کے بیٹے اُن کے جانشین ہوئے، اسی طرح خاندان بنی عباسیہ کے پہلے چوبیس حکمرانوں میں سے صرف چھ کے بیٹے اُن کے جانشین ہوئے، بزرگیٔ عمر کا قدیم خیال ہمیشہ ایک باپ کے لئے مانع آتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے واسطے سلطنت چھوڑ جائے، فرداً فرداً بہت مثالیں ایسی ہیں جن سے عربوں کے اس قدیم طریقۂ انتخاب کی مضبوطی ظاہر ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال لوگوں کے دلوں میں کسی قدر استحکام کے ساتھ جاگزیں ہو گیا تھا۔ عبد الملک نے چاہا کہ تمام قوم کی رائے عامہ حاصل کرکے اپنے دونوں بیٹوں کا انتخاب کرے، چنانچہ اس نے صوبوں کے گورنروں کے نام احکام صادر کیے کہ وہ اپنا تمام رسوخ استعمال کریں اور جو کوئی مخالفت کرے، اس کو مغلوب کریں۔ اس غرض کے لئے مکہ کے حاکم نے لوگوں کو یکجا جمع کرکے ان کو راضی کرنے کی کوشش کی لیکن اس زمانہ کے ایک نہایت بارسوخ فقیہ سعد ابن مصعب نے ایک حکمراں بادشاہ کی زندگی میں جانشین کا انتخاب کرنے سے قطعاً انکار کر دیا۔ حاکم مکہ نے دھمکی اور بدسلوکی سے اُن کو ڈرانا چاہا، لیکن وہ اپنی رائے پر قایم رہے۔ اس معاملہ کی اطلاع جب عبد الملک کے پاس پہنچی تو انہوں نے حاکم مکہ کو فہمائش کرتے ہوئے لکھا "یا تو تم کو اس شخص کو مار ڈالنا چاہیئے تھا یا اس سے کچھ تعرض نہ کرنا چاہیئے تھا" چنانچہ موخر الذکر طریقہ پر عمل کیا گیا اور اس سن رسیدہ شخص کو پھر دق نہیں

کیا۔ لیکن تاریخ خلافت سے بلاشبہ یہ امر ثابت ہے کہ جمہور کا ایک شخص کا انتخاب کرلینا یا حکمراں بادشاہ کا کسی کو اپنا جانشین نامزد کر دینا اور پھر اجماع جمہور سے اس کی تصدیق ہو جانا یہی دو باتیں تخت خلافت کی مستحق بنا سکتی تھیں۔ یہاں پر ہم مفصلاً یہ نہ بیان کریں گے کہ کس طرح دھوکہ دے کر سفاح نے علوی دعویداران خلافت کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی۔ اور نہ ہم علویین کے قتل واستیصال کی بے رحمانہ پالیسی پر بحث کریں گے، جس سے واضح ہو سکتا ہے کہ منتخب شدہ خلیفہ کی اطاعت فرمانبرداری کی قسم کیسی متبرک متصور ہوتی تھی۔ خلیفہ ہادی نے تخت خلافت پر متمکن ہوتے ہی پہلی بات یہ کی کہ اس نے ہاروں الرشید کی جانشینی کو مسترد قرار دیا اور اس کے بجائے اپنے فرزند جعفر کو جانشین مقرر کیا۔ یحییٰ ابن خالد نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خلیفہ ہادی سے کہا۔

"امیر المومنین، اگر آپ لوگوں کو ان کے قسموں کے توڑنے کی جرأت دلائیں گے تو آئندہ عہد و پیمان کی وقعت بالکل مٹ جائے گی، برعکس اس کے اگر آپ لوگوں کو اپنے بھائی کی اطاعت پر قایم رہنے دیں گے اور جعفر کو اس کا جانشین مقرر ہونے کا اعلان کریں گے تو عہد و بیعت کا وہ تقدس قایم رہے گا۔"

الغرض انتخاب بیعت کا رشتہ ایک رشتۂ مقدس خیال کیا جاتا تھا جو بادشاہ کو رعایا کے ساتھ ہم رشتہ کر دیتا تھا۔ ایک دفعہ جب انتخاب عمل میں آجاتا تھا اور بیعت کرلی جاتی تھی تو بادشاہ اور رعایا کے مابین رشتہ مکمل ہو جاتا تھا۔

انتخاب کی مثال ایک نہ ٹوٹنے والی کڑی کی سی تھی جو انتخاب کنندگان کو منتخب شدہ بادشاہ کے ساتھ وابستہ کر دیتی تھی۔ انتخاب میں خاص خاص حقوق اور خاص خاص فرائض مضمر ہوتے تھے، جن کی ایمانداری سے انجام دہی پر باہمی رشتہ کا قیام منحصر تھا۔

ہمارے پاس ایک خطبہ ہے، جو یزید ثالث سے منسوب کیا جاتا ہے اور اس دستاویز سے اس جمہوری خیال کا اظہار ہوتا ہے جو اہل عرب، امیر المومنین کی بابت رکھتے تھے۔

یزید کا ذکر ہے کہ اس نے اپنے چچیرے بھائی ولید ثانی کے برخلاف جو ایک اوباش اور مسرف شخص تھا سازش قایم کی اور محل میں جا کر اس کو قتل کر ڈالا۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنے افتتاحیہ خطبہ میں کہا ہے۔

"بخدا، میں اپنے ذاتی نفع یا کسی دنیاوی خواہش یا سلطنت سے ولید کی مخالفت میں کھڑا

نہیں ہوا اور میں یہ از راہ خود بینی نہیں کہتا کیونکہ بے شک میں گنہگار ہوں (اگر اللہ مجھ پر رحم نہ کرے) بلکہ میں نے خالصاً لوجہ اللہ اور دین الٰہی کے جوش میں ایسا کیا۔ میں نے لوگوں کو خدا، اس کے کلام پاک اور رسول کے اقوال پر چلنے کی دعوت دی، کیونکہ احکام مذہبی فراموش کر دئے گئے تھے، صداقت کے اثرات مٹ چلے تھے۔ اور الہام کی روشنی ضعیف ہو گئی تھی، میں بالاعلان کہتا ہوں کہ ولید ایک خود سر، ظالم شخص تھا، اور ممنوع چیزوں کو مباح سمجھتا تھا، اور ہر طرح کے شرک و کفر کو جائز خیال کرتا تھا، نہ تو قیامت کا اسے یقین تھا اور نہ قرآن پر اس کا ایمان تھا، جب میں نے اس بات پر غور کیا تو باری تعالیٰ کی ہدایت سے استمداد کی۔ چنانچہ اس کے بہت سے پرستاروں نے میری بات کو گوش دل سے سُنا، میں نے ظالم پر چڑھائی کی اور خدا نے اپنے بندوں کو اس کے ظلم سے نجات دی۔ یہ میری طاقت سے نہیں ہوا بلکہ اسی کے فضل سے ہوا۔ اے لوگو، میں اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ نہ عمارت تعمیر کراؤں گا نہ جدید نہریں کھدواؤں گا اور نہ محلات بنواؤں گا، نہ مال و دولت جمع کر کے انبار لگاؤں گا اور نہ اپنی بیوی بچوں کو مالا مال کروں گا، میرے ذمہ تمہارا سالانہ وظیفہ اور ماہانہ آذوقہ واجب ہے تاکہ مسلمانوں کی خوشحالی میں اضافہ ہو اور دور و نزدیک کے سب مسلمان اس میں شریک ہو سکیں، اگر میں اپنا وعدہ ایفا کروں تو تم میری بات کو سنو اور بخوشی میری فرمانبرداری کرو، میرے معاون و مددگار بنو اور میری حفاظت کرو، اور اگر میں اپنا وعدہ پورا نہ کروں تو تم کو اختیار رہے مجھے تخت سے اُتار دو، لیکن اس کے لئے تم کو مجھے وقت پر تنبیہ کرنا لازم ہے، اگر میں اپنی حالت کی اصلاح کر لوں، تو پھر میری معذرت قبول کرو اور اگر تم کسی ایسے آزمودہ کار شخص سے واقف ہو جو بخوشی تمہارے سامنے وہ سب کچھ پیش کرتا ہے جو میں پیش کرتا ہوں، تب ایسے شخص کو پسند کر لو اور اگر تمہاری بھی خواہش ہو گی تو میں پہلے اُس کے ہاتھ پر بیعت کروں گا، اور اس کی فرمانبرداری کروں گا۔ اے لوگو! تم کو معلوم ہے کہ ایسے شخص کا حکم مانا نہیں جاتا جو کسی ایسے فعل کے کرنے کا حکم دیتا ہے جو گناہ ہے میں تم کو یہ خطبہ سُناتا ہوں اور خدا تعالیٰ سے اپنی اور تمہاری مغفرت کی دعا مانگتا ہوں" (مسعودی جلد پنجم صفحہ ۴۵۸)

یہاں ہم کو داؤد ابن علی کی ایک تقریر یاد آگئی جو بالکل اس پر منطبق ہوتی ہے، جب بنو عباس کی مراد بر آئی اور منظفر و منصور ہو کر تخت خلافت پر متمکن ہوئے تو داؤد ابن علی (سفاح کے چچا) نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:۔

"ہم خدا تعالیٰ، اس کے پیغمبر اور آل عباس کے نام کی قسم کھاتے ہیں کہ ہم اللہ کے احکام کے مطابق تم پر حکومت کریں گے، اس کی کتاب پاک کے مطابق تم پر قانون جاری کریں گے اور ادنیٰ و اعلیٰ سب کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو پیغمبر صلعم کیا کرتے تھے" (ملاحظہ ہو ابن اثیر جلد پنجم صفحہ ۱۳۱)

ان دونوں خطبوں سے ظاہر ہے کہ عرب اپنے فرمانروا کو ایسا شخص تصور نہ کرتے تھے، جس پر نکتہ چینی نہ کی جاسکے یا جس کے ناجائز فعل پر ملامت نہ ہوسکے۔ اس سے حقیقتاً عیاں ہوتا ہے کہ اپنے عہد متابعت اور فرمانبرداری کے مقابلہ میں وہ اپنے فرمانروا سے اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ وہ اپنے فرائض کو اچھی طرح انجام دے۔

اس امر کے نظائر موجود ہیں کہ جب کبھی خلیفہ نے کسی غیر منصفانہ فعل کا ارتکاب کیا یا حسب توقع خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام نہیں دئیے تو متقی اور خدا ترس لوگوں نے اس کو متنبہ کرنے یا ملامت کرنے سے کبھی اعراض نہیں کیا۔

خلیفہ ہارون الرشید نے، سفیان ثوری کو ایک بار طلب کیا، انہوں نے جواب میں لکھا کہ "میں تجھکو بغرض آگاہی لکھتا ہوں کہ میرا تجھ سے قطعاً قطع تعلق ہو گیا ہے، میں نے تیری محبت ترک کردی ہے اور تو نے مجھ کو اپنے خلاف شاہد بنا لیا ہے کیونکہ تو نے خود اپنے خط میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تو نے مسلمانوں کا خزانہ غصب کرلیا ہے تو اس کو ایسے مصارف میں لایا ہے جو نا درست تھے اور تو نے ایسے شخصوں کے پاس اس کو بھیج دیا ہے جو اس کے مستحق نہ تھے اور تو نے اسی پر قناعت نہ کی کہ مجھ سے دور تو نے ایسے فعل کا ارتکاب کیا بلکہ تو نے معاملہ کو معرض تحریر میں لاکر مجھ کو اپنے خلاف شاہد بنا لیا ہے اور اب میں اور میرے وہ بھائی جنہوں نے کہ تیرے خط کو دیکھا ہے اس بات کے شاہد ہیں کہ قیامت کے دن خدائے عادل کے حضور میں تیرے خلاف شہادت دیں گے۔ اے ہارون، کیا تو نے فی الحقیقت مسلمانوں کے خزانہ کو ان کی بلا اجازت غصب کرلیا ہے، کیا تو نے ان لوگوں کی رضامندی حاصل کرلی ہے جن کے سینوں میں قرآن پاک کی دولت جمع ہے کیا تو نے علماء کی رائے سے ایسا کیا ہے کیا بیواؤں، یتیموں اور تیری رعایا میں سے کسی اور جماعت نے تجھے ایسا کرنے کی اجازت دیدی ہے؟"

(ملاحظہ ہو جلد دوم صفحہ ۱۸۸ از یداث صفحہ ۲۵۵)

خلافت کی مذہبی حیثیت اول چار خلفاء کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے، اس وقت یہ خالصاً ایک مذہبی

منصب تھا، جس پر وہ لوگ مامور تھے، جنہوں نے راہِ اسلام میں اپنی عزیز ترین چیزوں کو قربان کر ڈالا تھا وہ نماز کے وقت امامت کرتے تھے، دیگر فرائض منصبی انجام دیتے تھے، اور مومنین کے امین اور معتمد ہونے کی حیثیت سے سلطنت کا انتظام کرتے تھے، انہوں نے اپنی فتوحات کے درخشاں عہد میں بھی اپنے مقصد کو فراموش نہیں کیا اور نہ اپنے فرائض میں تغافل کیا، مگر یہ توقع نہ ہو سکتی تھی کہ یہ نظام جانشینی مدت مدید تک جاری رہے گا۔ اس لئے مذہبی حیثیت کا سلطنت میں تبدیل ہونا فطرت کا اقتضاء تھا تاہم خلافت کے مذہبی فرائض اور اس کی مذہبی حیثیت وقتاً فوقتاً دھندلی ہو گئی کلیتہً منہدم نہیں ہوئی۔

بنو امیہ میں مذہبی احساس بہت کم تھا، ظلم و ستم سے انہوں نے اپنی رعایا کو اپنا مخالف بنا لیا تھا اور اپنی بے دینی کی وجہ سے متقی اور پرہیزگار آدمیوں کو سخت ناراض کر دیا تھا۔ بالآخر اہل خراسان نے جو کہ پیروان علی کا صدر مقام اور بغاوت کا مرکز بنا ہوا تھا اُن کے اختیارات سلب کرنے اور خلافت کو عباسیوں میں منتقل کرنے کے لئے قدم بڑھایا۔

بمقابلہ بنی امیہ کے عباسیہ خاندان کا خلیفہ مذہبی پیشوا کی حیثیت رکھتا تھا وہ نہ صرف حکومت دینی (Hierarchy) کا سردار ہوتا تھا بلکہ خود زعیم دینی (Hierarch) بھی ہوتا تھا وہ نہ صرف سلطنت کا فرمانروا ہوتا تھا بلکہ دین کا پیشوا بھی تھا۔ جماعت اسلامی کے دینی معاملات میں وہ اپنے آپ کو پیغمبر کا جانشین تصور کرتا تھا اور بحیثیت جانشین اپنے تئیں ایک ایسے منصب پر خیال کرتا تھا جو خدا تعالیٰ کا قائم کردہ تھا، بنی امیہ، عصا اور خاتم کو اپنی طاقت شاہی کی علامت سمجھتے تھے، لیکن بنو عباس میں پیغمبر صلعم کی ردا بھی شامل تھی کہتے ہیں کہ یہ ردا، کعب ابن ظہیر کو بطور نشان عزت ملی تھی، بنی عباس اس چادر کو اس وقت اوڑھتے تھے، جبکہ وہ اپنی رعایا سے بیعت لیتے تھے علاوہ اس کے تمام اہم تقریبوں میں اس کو پہنا کرتے تھے، لیکن بالخصوص اس وقت جبکہ وہ باجماعت نماز پڑھاتے تھے۔

الغرض عباسیوں نے اپنے عمال سے مذہب کا احترام قائم کرنے کی پوری کوشش کی۔ تاکہ رعایا کی نظروں میں اُن کی مذہبی حیثیت قائم رہے ورنہ ہلاکو کے حملہ سے بہت قبل نظام خلافت درہم برہم ہو گیا ہوتا۔ اور خلیفہ بغداد کی مذہبی حیثیت خاک میں مل گئی ہوتی۔ (باقی آئندہ) سیّد وزارت علی

ہوا کے کرشمے

وہ نظر نہ آنے والی، ہلکی، خنک ہوا جسے دُنیائے شاعری میں نسیم و صبا کہتے ہیں، جس کی وساطت سے سارے جہان کے عشاق اپنا پیام، محبوب و سرزمین محبوب تک پہونچایا کرتے ہیں اور جو کسی کے بالوں میں جنبش اور لباس میں اک حسین بے ترتیبی پیدا کرکے، خدا جانے کس قدر سرمایۂ شعر پیدا کر جاتی ہے آپ سمجھتے ہیں کہ جب وہ برہم ہو جاتی ہے، جب وہ ذرا خشونت سے کام لیتی ہے، تو منظرِ حسن و عشق کو کس صورت میں تبدیل کر دیتی ہے، اور عالم میں کتنا ہنگامہ پیدا ہو جاتا ہے۔؟

مناظرِ فطرت کی داستان کا وہ حصہ، جس کا تعلق خود قوائے فطرت کے کارناموں سے ہے، غالباً کائنات کا دلکش ترین افسانہ ہے، اور اگر کوئی شخص غور و تامل سے کام لے، تو وہ بہت کچھ اسبابِ لطف و مسرت اُس کے مطالعہ سے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ بڑے بڑے دریا، یہ عظیم الشان پہاڑ، یہ وسیع صحرا، یہ طویل و عریض آبادیاں، یہ موجیں مارنے والے مہیب سمندر، جو رات دن ہماری توجہ اپنی طرف جذب کرتے رہتے ہیں، یقیناً خدا کی بہترین نشانیاں ہیں، لیکن کیا ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ہم ہوا کے وجود کو فراموش کر سکتے ہیں، جو اگر ذرا برہمی کے ساتھ چند ماہ تک ایک ہی سمت میں اپنی رفتار کو قایم رکھے، تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں، دریا خشک ہو جائیں، صحرا دریا بن جائے اور دُنیا کی تمام متمدن و غیر متمدن آبادیاں صفحۂ ہستی سے اس طرح معدوم ہو جائیں، گویا وہ کبھی عالمِ وجود ہی میں نہ آئی تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہوا ایک خادم کی حیثیت سے ہماری بہترین معاون ہے، وہ ہمارے لئے چکیاں چلاتی ہے، غلہ پیستی ہے، پانی فراہم کرتی ہے، متمدن ممالک میں ڈاک پہونچاتی ہے، مکان صاف کرتی ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ہماری ہستی کو قایم رکھتی ہے، لیکن جب وہ ایک خادم کی حیثیت چھوڑ کر ہماری مخدوم بن جاتی ہے اور اپنا اقتدار ہم پر ثابت کرنا چاہتی ہے، تو اس سے زیادہ ہولناک، اس سے زیادہ مہیب اور اس سے زیادہ تباہ کن چیز دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

یہ صحیح ہے کہ اگر ہوا میں تیزی نہ ہو تو اس میں گردش پیدا نہیں ہو سکتی اور کوئی سانس لینے والا جاندار روئے زمین پر زندہ نہیں رہ سکتا، لیکن باوجود اس علم کے، ہمیں اس امر پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس کو

روکنے کی تدابیر اختیار کریں اور اس کو زیادہ بے تکلف نہ ہونے دیں ورنہ ظاہر ہے کہ مکانوں کی دیواریں بالکل بیکار چیز ہیں اور صرف ستونوں پر ایک چھت قائم کر کے ہم حرارت و بارش سے بچ سکتے ہیں اور سرد ممالک میں ایک بار مکان کی ہوا کو گرم کر لینا مہینوں تک ہمیں ٹھنڈ سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

پھر ایک انسان کی کمزوری کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ باوجود تمام احتیاط و تدابیر کے بھی مخلوقاتِ خداوندی میں سے ایک معمولی چیز، ہوا کا بھی حریف نہیں بن سکتا، دیوارِ چین، انسان کی ایک خونخوار ترین قوم کے لئے تو یقیناً حجاب ہو سکی، لیکن وہ ہوا کا مقابلہ نہ کر سکی جو اُسے ایک ریگ کے طویل تودہ میں تبدیل کرتی جاتی ہے۔

چونکہ ہمیں ہوا دکھائی نہیں دیتی اور صرف اس کے نتائج نظر آتے ہیں اس لئے اُسے زیادہ اہم نہیں سمجھتے، حالانکہ اس نے حقیقتاً دُنیا کی صورت بدل دی ہے اور ایشیا و افریقہ کے بڑے بڑے شہروں کو صفحہ زمین سے حرفِ غلط کی طرح محو کر چکی ہے۔ گوبی کا وہ صحرائے عظیم جو اِس وقت، دس لاکھ مربع میل زمین کو گھیرے ہوئے ہے، کسی وقت آباد تھا، انسانی تہذیب و شائستگی کی علامات سے معمور تھا، اس میں دریا بہتے تھے جھیلیں موجیں مارتی تھیں، تجارت جاری تھی، قافلے گذرتے تھے، معابد آباد تھے، دولت بکھری ہوئی تھی، سربفلک محل قایم تھے، لیکن آج وہ صرف اک گرم ریگستان ہے اور ہوا نے اس کے دریا کو خشک، اس کی جھیلوں کو عمیق گڈھوں میں تبدیل کر کے، اس کی آبادی کو بالکل معدوم کر کے ایک بے آب و گیاہ خوفناک ریگزار بنا دیا ہے۔ نہ وہاں اب کاروان گذرتے نظر آتے ہیں نہ معابد ہیں نہ آبادیاں، نہ کوئی متنفس نظر آتا ہے، نہ کوئی اور اثر حیات۔

اگر وسط ایشیا کی اس قدیم تہذیب کو پامال کرنے کے لئے، تمام انسانی خونخواریاں اور بے رحمیاں صرف کر دی جاتیں اور مہلک ترین آلاتِ آتش بار استعمال کئے جاتے، تو بھی یہ نتیجہ نہ پیدا ہوتا جو ہوا نے کر دکھایا۔

یہ درست ہے کہ سمندروں کے تلاطم، دریاؤں کے سیلاب، وحشی اقوام کے حملوں نے بعض قطعاتِ زمین کو تباہ کر دیا ہے، لیکن ہوا نے تو ملک کے ملک غارت کر دئے ہیں اور اگر علمائے جغرافیہ و طبقات الارض کی تحقیق پر اعتماد کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ براعظم ایشیا کو ایک دن اسی طرح بالکل معدوم ہو جانا ہے، جس کی زمین نہایت سرعت کے ساتھ خشک ہوتی جا رہی ہے اور ہوا کی ان تباہ کاریوں کے لئے وسیع جولانگاہ پیدا کر رہی ہے۔

گذشتہ دو ہزار سال کے اندر مغلستان، زیر زمین دفن ہو چکا ہے، ایران ریگستان میں تبدیل ہوتا جاتا ہے

ہے، ظاہر ہے کہ جب زمین میں کافی نم باقی نہ رہے گا جو نباتات، درخت، لباس اور جنگلوں کے قیام کے لئے ضروری ہے تو یہ سارا حصۂ زمین ریگستان بن جائے گا، اور ایک دن ایشیا کا تمام شمالی حصہ، اسی طرح محو ہو جائے گا، جس طرح مغلستان کی قدیمی تہذیب۔

اب شمالی افریقہ کو دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیا اسباب تھے، جن کی بنا پر ایک مخصوص قطعۂ زمین ایسا خشک ریگستان بن گیا اور اس کے چاروں طرف ہنوز آبادی و رونق موجود ہے۔ نہر سویز کے بقار کا مسئلہ صرف ہوا کی وجہ سے معرض خطر میں ہے کیونکہ ہوا کثرت سے ریگ اس میں ڈالتی رہتی ہے اور اگر ہر سال کثیر صرف کر کے ساتھ صفائی نہ ہوتی رہے، تو وہ دو سال کے اندر نہر سطح زمین کے برابر ہو جائے۔ کم و بیش یہی کرشمے ہوا کے جنوبی افریقہ، امریکہ اور آسٹریلیا میں بھی پائے جاتے ہیں۔

الغرض ہوا کی قوت، عجیب و غریب صورتوں سے ظاہر ہوتی رہتی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عالم میں کیا نہیں کر سکتی۔ اگر وہ ایک طرف دریاؤں اور نہروں کو خشک کر کے سطح زمین کے برابر کرتی رہتی ہے تو دوسری طرف چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر کے اڑا دیتی ہے اور بڑی بڑی بلندیوں کو جھیلوں میں تبدیل کر دیتی ہے خدا جانے کتنے پہاڑی مقامات ہموار ہو کر زمین بن گئے، اور کتنی زمینیں بلند ہو کر ریگ کا پہاڑ ہو گئیں، اسی کے ساتھ یہ کیسا عجیب و غریب تماشا ہے کہ وہی ہوا جو ایک جگہ ایسی بربادیاں پھیلاتی ہے، دوسری جگہ اسی بربادی کو آبادی کا سبب بنا دیتی ہے۔ اگر خاک کے باریک ذرہ بلند ہو کر ہزاروں میل کا سفر اختیار کرتے ہیں تو اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ جہاں پہونچتے ہیں اس جگہ کو زرخیز بنا دیتے ہیں، چنانچہ وادیٔ نیل کا تمول انہیں ذروں سے قایم ہے جو خدا جانے کہاں کہاں سے اڑ کر یہاں جمع ہو گئے ہیں۔

ہوا جس طرح خشکی میں اپنی قوت کی نمائش کرتی ہے، اسی طرح وہ پانی کے ساتھ بھی جنگ کرتی ہے اور آخر کار وہ کامیاب ثابت ہوتی ہے، دریاؤں کو ان کے مجرا سے ہٹا دینا، ان کے رفتار کی سمت بدل دینا، اور بڑے بڑے قطعاتِ بحر کو خشک کر کے زمین کے برابر کر دینا اس کا معمولی کرشمہ ہے۔ گذشتہ تین صدی کے اندر سب سے زیادہ نمایاں مثال اس نوع کی فرانس میں پائی جاتی ہے، جہاں ہوا نے دریائے اڈور کا رخ متعدد بار ادھر سے ادھر کر دیا ہے اور ساحل گیسکن کے سمندر کو ایک سو میل کے رقبہ تک بالکل خاک و ریگ سے پاٹ دیا۔

ہوا زمین کی خاک کو جس قدر طویل سفر کراتی ہے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۸۳ء

میں جب جزیرہ کراکٹو کا کوہ آتش فشاں مشتعل ہو تو ہوا اُس کی راکھ کو سارے کرہ ارض کے گرد لئے پھری اور یہ سفر صرف اُس نے پندرہ دن کے اندر طے کرلیا، اس راکھ کے بعض اجزا ایسے بھی تھے، جنہیں مسلسل تین بار ہوا نے زمین کے گرد پھرایا اور بعض کو برابر تین سال تک گردش میں رکھا، الغرض دُنیا کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا، جہاں اس خاک کے ذرات نہ پہونچے ہوں۔

ہوا کی تباہ کاریاں اس قدر کثیر اور عام ہیں کہ اگر اُن کا استقصا رکیا جائے تو اس عنصر کی نہایت ڈراؤنی تاریخ مرتب ہوسکتی ہے، جس وقت اڈی اسٹون کا سب سے پہلا مینار روشنی کا بنایا گیا تو چار سال تک وہ نہایت محفوظ حالت میں رہا، لیکن ایک رات، جو ہوا برہم ہوئی تو اس کو اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیا اور چٹانوں سے ٹکرا کے چور چور کردیا، پھر اُس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ہزاروں مکانوں کو مسمار کرکے خدا جانے کتنے آدمیوں اور جانوروں کو تباہ کردیا، اور لندن کے ہزاروں دُو دکش زمین کے برابر ہوگئے۔ دریائے ٹیمس کو ۲۰ فٹ بلند کرکے ایک ہزار کشتیاں اس نے غرق کردیں۔

۱۸۹۰ء میں جب سموڈا کے اندر ہوا کا طوفان آیا تو بڑے بڑے جہازوں کا سطح آب پر یہ عالم تھا جیسے لڑکوں نے کاغذ کی کشتیاں بنا کر چھوڑدی ہوں، صرف ایک جہاز سلامت رہا اور وہ بھی اس طرح کہ دس ہزار گھوڑوں کی طاقت صرف کرنے کے بعد بھی وہ ہوا کے مقابلہ میں ایک انچ آگے نہ بڑھ سکا اور کامل ۴۸ گھنٹے تک اپنی جگہ پر ہچکولے کھاتا رہا۔

اسی طرح ۱۸۳۱ء میں ویسٹ انڈیز میں طوفان آیا اور چند گھنٹوں کے اندر ڈیڑھ ہزار آدمیوں کو فنا کرگیا۔ اس طوفان نے ۲۵ ہزار میل کا سفر کیا اور جہاں کہیں پہونچ گیا اک عام تباہی پھیلادی، درخت اُکھڑ گئے، مکان گر گئے، بڑی بڑی توپیں گاڑیوں سے سرک کر زمین پر آرہیں، سمندر میں طغیانی پیدا ہوگئی جہازوں کے لنگر قائم نہ ہوسکے اور کھیتیاں تباہ و برباد ہوگئیں۔

چند سال ہوئے کنٹکی میں ہوا کا طوفان آیا اور میلوں تک جنگلوں کو اس طرح صاف کردیا جیسے یہاں سے کوئی لشکر گذر گیا ہے، سینکڑوں مکان گر گئے، اور ہوا کی سمت کوئی درخت کوئی مکان، کوئی ستون تار کا قائم نہ رہ سکا۔

آئرلینڈ اور امریکہ میں جب طوفان آتا ہے تو ریل پٹری سے اتر جاتی ہے، ساحل کلیر پر تو ہوا کی سختی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ریل کی ریل پٹری سے اُڑ کر دُور جا گرتی ہے، چنانچہ اس نواح کی

ریلوں میں ایک آلہ طوفان پیما لگا رہتا ہے، اور اسی کے ساتھ ایک برقی [گھنٹی] ہوتی ہے۔ جب ہوا کی رفتار ۵۰ میل فی گھنٹہ ہو جاتی ہے تو یہ گھنٹی بجنے لگتی ہے اور ٹرین کو خارجی وزن سے بھاری بنا دیا جاتا ہے اور جس وقت یہ رفتار ۸۵ میل فی گھنٹہ ہو جاتی ہے تو ریلوں کی آمد و رفت بند کر دی جاتی ہے۔

ہوا اس تباہکاری کے ساتھ کبھی کبھی خوش طبعی سے بھی کام لیتی ہے۔ اوہیو کے ایک قصبہ میں ہوا نے ایک لڑکے کو مکان کی کھڑکی سے اُٹھا کر باہر پھینک دیا اور سو گز تک بلند لے گئی، وہاں پہونچکر لڑکے نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا لکڑی کا مکان بھی غائب ہو چکا ہے اور زمین سے اندازاً ساٹھ گز اوپر معلق ہے۔ اس مکان کے بعض تختوں کو ہوا ساڑھے آٹھ میل تک لے گئی اور وہاں زمین میں اس طرح نصب کر دیا جیسے کسی نے نہایت اہتمام سے یہاں گاڑ دیا ہو۔ ایک اور موقع پر ہوا نے کسی کے ڈسک کو جس میں تین قفل لگے ہوئے تھے توڑ کر اس کی چیزوں کو منتشر کر دیا اور ایک کھڑکی کو ۲۰ میل تک اُڑا کر لے گئی۔

بظاہر ہوا کا میلوں تک چیزوں کو اڑا لے جانا مستبعد معلوم ہوتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب وہ جنبش میں آجاتی ہے تو پھر بہت دیر بعد حالت سکون میں آتی ہے۔ جب ریل اپنی پوری رفتار سے سفر کرتی ہے تو نہایت آہستہ آہستہ تدریجی انحطاط کے ساتھ وہ ٹھیرتی ہے، پھر ظاہر ہے کہ ہوا جو اتنی عظیم الشان چیز ہے جب حرکت میں آجائے گی تو اس کے ٹھیرنے کے لئے کتنا وقت درکار ہو گا، ایک پروفیسر نے اندازہ کیا ہے کہ اگر تمام کرۂ ہوا بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت میں آجائے، تو کم از کم ۳۴ ہزار سال اس امر کے لئے درکار ہوں گے کہ اس کی رفتار بیس میل سے گھٹ کر دس میل فی گھنٹہ تک پہونچ جائے۔

اب اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ہوا ہمارے لئے مفید کس قدر ہے اور دُنیا کی رونق میں اس نے کتنا حصہ لیا ہے۔ اگر ہوا کا وجود نہ ہوتا تو نہ کولمبس، امریکہ دریافت کر سکتا اور نہ ڈریک کرۂ ارض کے گرد گھوم سکتا، نہ کوک آسٹریلیا کی مہم سر کر سکتا اور نہ قدیم انسان اپنے قدیم وطن کو چھوڑ کر دُنیا میں منتشر ہو سکتا یہ ہوا تھی جس نے بادبانی جہازوں کو تمام اطرافِ عالم میں لے جا کر انسان کو روئے ارض پر پھیلایا اور تہذیب و تمدن کی بنیاد قایم کی۔ دخانی جہاز تو اس وقت کی اختراع ہے، لیکن اس سے قبل تجارت، صنعت و حرفت، دولت اور سب وہ کچھ جو تمدن کے وسیع بین الاقوامی تعلقات سے وابستہ ہے، بادبانی جہازوں

ہی کے ذریعہ سے قائم تھا، اور ہوا کی جنبش ہی پر اس کا وجود منحصر تھا۔

ہوا کی دوسری عظیم برکت بارش ہے، حرارتِ آفتاب سے پانی کے اجزا دھوئیں کی صورت میں بلند ہوتے ہیں اور اوپر پہونچ کر بادل بن جاتے ہیں، اس کے بعد فطرت ہوا کو طلب کرتی ہے اور ان بادلوں کو ادھر اُدھر لے جانے کی خدمت اس کے سپرد کر دیتی ہے، اگر ہوا نہ ہو تو بادل جم کر ایک جگہ رہ جائیں اور ساری کھیتیاں خشک ہو جائیں۔ چنانچہ ہمارا تجربہ ہے کہ جس سال ہوا نہیں چلتی اکثر مقامات میں قحط ہو جاتا ہے اور ہزاروں مخلوق مر جاتی ہے۔

علاوہ اس کے موسموں کا تغیر و تبدل، زمین کی اصلاح، لوگوں کے مزاج کا اعتدال بہت کچھ ہوا پر منحصر ہے۔ مثلاً جزیرہ انگلستان اگر جنوب و مغرب کی ہوا سے محروم ہو جائے تو وہاں کے لوگ سردی کی وجہ سے برف کی طرح جم کر رہ جائیں یا اگر حبش وغیرہ میں شمالی ہوا کا گذر نہ ہو تو حرارت آفتاب کی وجہ سے وہ جل کر خاک ہو جائیں۔ نباتاتی دنیا میں بھی اس کے کارنامے عجیب و غریب ہیں، تم نے دیکھا ہوگا کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں لاکھوں قسم کے پھول اور درخت نظر آتے ہیں۔ یہ سب ہوا کی وجہ سے ہیں کیونکہ یہی مختلف مقامات کے بیج ادھر سے اُدھر منتقل کرتی ہے اور بہت سے خشک مقامات کو شاداب بنا دیتی ہے۔

الغرض ہوا، فطرت کی قوت کا عجیب و غریب مظہر ہے اور اس کی داستان نہایت پر لطف۔ اگر ایک طرف وہ لوگوں کو کبھی کبھی تکلیفیں پہونچاتی ہے، تو دوسری طرف اس سے ہماری راحت و آسائش کے اسباب بھی متعلق ہیں اور اگر کسی وقت برہم ہو کر تباہیاں پھیلاتی ہے، تو اس سے زیادہ، وہ حسن و حیات کے ذرائع بھی دنیا میں منتشر کرتی رہتی ہے، جس سے تمام کائنات مستفید ہوتی ہے۔

غزل

جانا یہ کس طرح کہ محبت نہیں مجھے
ہاں تم سے عرضِ حال کی جرأت نہیں مجھے

مانا کہ مستحقِ محبت نہیں ہوں میں
یہ بھی نہ کہہ مگر کہ "محبت نہیں مجھے"

آرام دن کا، رات کا سونا، سکونِ جاں
ہاں، تم سے چھوٹ کے کون سی راحت نہیں مجھے

پھر ہات میرے سینہ پہ رکھہ کر کہو کہ "ضبط"
پھر میں کہوں کہ اُس کی تو طاقت نہیں مجھے

وہ نزع میں نیاز کا لکھہ بھیجنا اُسے
آؤ نہ اب، کہ صدمۂ فرقت نہیں مجھے

کلامِ آسی

اُردو شاعری کلیتاً فارسی شاعری کی متبع ہے اور اِس باب میں اس قدر غلو کیا گیا ہے کہ عام طور سے وہی تشبیہات و استعارات اُردو میں بھی لے لئے گئے ہیں جو فارسی میں مروج ہیں، حالانکہ وہ یہاں کی نہ تو پیداوار ہیں اور نہ یہاں سے اُن کا کوئی تعلق و واسطہ، مگر ابتدا میں اس طرف خیال مائل ہی نہیں ہوا کہ اُن چیزوں کی تشبیہات زیادہ کیف انگیز ہوتی ہیں جن کا تعلق اُس ملک اور قوم سے ہو جس ملک و قوم کی زبان میں شعر کہا جائے، بدیں وجہ جو معیار پیش نظر تھا اُس کا ہو بہو چربہ اُتارنے کی کوشش کی گئی، مگر اسی کے ساتھ ایک بات نہایت تعجب انگیز یہ ہے کہ جہاں ایک طرف فارسی شاعری کے تتبع و تقلید کی اِس قدر کوشش کی گئی، وہیں دوسری طرف فارسی شاعری کی جو چیز جان تھی اِس کو عام طور پر ترک کر دیا گیا اور بہت کم اُردو شعراء نے اس کی طرف اعتنا کیا۔

میری مراد اِس سے مذاقِ تصوف سے ہے، جو حقیقتاً فارسی شاعری کی جان ہے، عام معلومات کی بناء پر خواجہ حکیم ثنائی نے سب سے پہلے تصوف کو شاعری سے روشناس کرایا، اُن کے بعد خواجہ عطار اور مولانا روم نے اِس مذاق کو اِس قدر وسعت دیدی کہ تصوف فارسی شاعری کا جزو لاینفک ہو گیا، تغزل کے میدان میں سعدی نے اس کو وسعت دی اور حافظ نے تو تصوف کو شاعری کے ساتھ ایسا سمویا کہ ہر دو اجزاء کو الگ الگ کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر تصوف کا رنگ فارسی تغزل سے الگ کر لیا جائے تو اِس میں کچھ باقی ہی نہ رہے، یہاں تک کہ ذیل کے مقولہ نے ضرب المثل کی صورت اختیار کر لی ہے کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" اگرچہ اِس مقولہ سے تصوف کی تنقیص کا ایک پہلو نکلتا ہے، مگر اِس سے قطع نظر کر کے مقولہ کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں۔

بہرحال مقصد یہ ہے کہ اُردو شعراء نے باوجودیکہ فارسی شاعری کی کورانہ تقلید سے بھی احتراز نہیں کیا، مگر پھر بھی جو چیز اِس قابل تھی کہ اس کی تقلید کی جائے اسی کو چھوڑ دیا یا یہ کہ بہت کم اِس کی طرف اعتنا کیا۔

میرے نزدیک اُردو شاعری میں جہاں اور بہت ہی کمیاں ہیں اُن میں ایک بہت بڑی کمی یہ

یہی ہے کہ مذاق تصوف کو اُردو شاعری سے بہت کم روشناس کرایا گیا۔

شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سب سے پہلے خواجہ میر درد نے اس کی اہمیت پوری طرح محسوس کی اور اپنے کلام میں نمایاں طور پر اسی رنگ کو جگہ دی، اس عہد کے شعراء میں خواجہ درد کے علاوہ تصوف کی کچھ چاشنی اگر پائی جاتی ہے تو میرزا مظہر جانجاناں کے کلام میں، مگر کم، اور اس امر پر تعجب بھی ہے کیونکہ ان کا فارسی کلام اس رنگ سے بالکل معمور ہے، مگر حیرت ہے کہ اردو کا کلام اس رنگ سے خالی نظر آتا ہے، حالانکہ مرزا صاحب ہندوستان میں عہد آخر کے مشہور صوفیائے کرام میں سے تسلیم کئے گئے ہیں۔

اِن دو بزرگوں کے علاوہ اُس عہد میں کیا، اس کے بہت بعد تک بھی کسی استاد کا نام اس خصوص میں نہیں لیا جا سکتا۔ البتہ عہد آخر میں غالب نے اس رنگ کو لیا ہے اور خوب لیا ہے، یا پھر حضرت شاہ نیاز بریلوی کا کلام پیش کیا جا سکتا ہے، جس کو اگرچہ شعری محاسن کی حیثیت سے بلند پایہ معیار پر جگہ نہیں دی جا سکتی مگر پھر بھی رنگ تصوف کی خوبی نے ان کے کلام میں ایک کیف ضرور پیدا کر دیا ہے۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ جن شعراء کے میں نے نام لئے ہیں اُن کے علاوہ ایک مثال بھی نہیں پیش کی جا سکتی یا کسی شاعر نے دو چار شعر بھی اس رنگ میں نہیں کہے، بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ توقع سے بہت کم توجہ کی گئی، اس قدر کم کہ بجا طور پر اظہار افسوس کرنا پڑتا ہے۔

عہد حاضر کی شاعری کا ترقی پذیر رُخ، اس میں شک نہیں کہ مذاق سلیم کی رہنمائی میں قطع منازل کر رہا ہے، گو اسی کے ساتھ سلسلۂ تلمذ و شاگردی سے بے نیازی برتنے اور اس کی ضرورت کو نہ محسوس کرنے کا بعض اوقات یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ بے راہ روی اور خود ساختہ تصرفات کرنے کی آزادی عیب کی حد تک پیدا ہو جاتی ہے مگر یہ لا علاج مرض نہیں ہے۔ سلیم المذاق اہل قلم کی توجہ فرمائی اور اساتذۂ دہلی کے کلام کا بکثرت اور بغور مطالعہ، جسم شاعری سے اس فاسد مادہ کا اچھی طرح تنقیہ کر سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ امر صد درجہ مسرت افزا ہے کہ لکھنؤ کی صنعت گری سے اقلیم سخن کی آب و ہوا میں جو مہلک جراثیم پیدا ہو گئے تھے، عہد حاضر کے شعراء اپنے دامن سخن سنجی و سخن گستری کو حتی الامکان اس سے ملوث نہیں ہونے دیتے، چنانچہ خود لکھنؤ کے موجودہ نامور شعراء مثلاً حضرات صفی، ثاقب، عزیز، محشر، ادیب، مس کا کلام اس امر کی زندہ مثال ہے کہ لکھنؤ بھی اپنی روش ابتذال و تصنع اور لفظی

طلسم آفرینی پر منتبہ ہوگیا ہے اور اس نے بھی وہی راستہ اختیار کر لیا ہے جو فطرت کی صحیح رہنمائی پر مبنی ہے اور جس راستہ پر لکھنؤ میں بھی انیس، آتش اور تعشق نے گام فرسائی کی ہے۔

بہر حال موجودہ دورِ شعری کا یہ رجحان، ہر آئینہ قابل ستائش ہے مگر آج بھی اس کمی کو پورا کرنے کی طرف سخن سنج حضرات بہت کم التفات کرتے ہیں، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

حضرت شاہ عبد العلیم آسی مرحوم، جن کے کلام پر میں آج ایک ناقدانہ نظر ڈالنی چاہتی ہوں اُن چند مخصوص افراد میں سے تھے، جن کے کلکِ سحر طراز نے اردو شاعری پر یہ احسان عظیم کیا ہے کہ تغزل کی جان یعنی مذاقِ تصوف کو اس سے بکمال خوبی و دلپذیری کے ساتھ ممزوج کیا ہے۔

آسی کا نام اور اُن کا کلام شعری دنیا کے لئے کوئی نیا اور عجیب نہیں ہے، جو لوگ علمی و ادبی رسائل کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ مولانا حسرت موہانی کے مشہور رسالہ اردوئے معلی میں حضرت آسی کا کلام بکثرت شائع ہو چکا ہے، مگر متفرق و منتشر موتی جب مرتب و منتظم صورت میں آجاتے ہیں تو اس وقت وہ اور زیادہ جاذب نظر ہو جاتے ہیں، نیز آسانی کے ساتھ صحیح رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ یہ سلکِ مروارید کس قیمت کی ہے۔

نہایت خوشی کی بات ہے کہ حضرت آسی کا کلام، عین المعارف کے نام سے مرحوم کے جانشین سید شاہد علی صاحب نے خاصے اہتمام کے ساتھ شائع کر دیا ہے، جس کی نسبت بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے خزانہ ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے اور گو یہ دیوان بہت مختصر ہے، لیکن جس طرح غالب و درد کے دیوان بقامت کہتر و بقیمت بہتر کے مصداق ہیں اسی طرح حضرت آسی کا یہ مختصر دیوان بھی اپنی نوعیت میں بے مثل ہے، جس کا صحیح اندازہ تو اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، مگر میں کوشش کروں گا کہ بالاختصار اُن کی شاعری کے رنگ سے قارئین نگار کو آگاہ کر دوں۔

حضرة آسی کا رنگِ تغزل جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، مذاقِ تصوف میں ڈوبا ہوا ہے، جو دیگر محاسن شعری کے ساتھ مل کر حد درجہ کیف انگیز ہو گیا ہے۔

آسی کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو مذاق سلیم کسی غزل میں تلاش کرتا ہے، انداز بیان کی متانت و پختگی، مضامین کا علو، خیالات کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی و لطافت اُن کے کلام

کے مخصوص عناصر ہیں اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو اُن کے کلام کو نیرنگی و اعتبار کے بلند درجہ پر پہونچا دیتی ہیں۔

ایک خاص خوبی حضرت آسی کے کلام کی یہ ہے کہ اُن کی غزلوں میں بھرتی کے شعر بالکل نہیں ہوتے اور سوقیت و عامیانہ مذاق سے اُن کا کلام بالکل پاک ہے، نیز جرأت و داغ کی طرح ہوسناکی کی سفاہت بھی اُن کے ہاں نہیں پائی جاتی، گو کبھی کبھی وہ لکھنؤ کے رنگ میں بھی ایک دو شعر کہہ جاتے ہیں، مگر اول تو بہت کم، اس کے علاوہ بعض وقت اس رنگ میں بھی ایک قسم کی خوبی پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی اُن کا کلام تغزل کے اس اعلیٰ اور بلند معیار پر ٹھیک اُترتا ہے جو مذاق سلیم اور وجدان صحیح نے قرار دیا ہے۔

اچھے اور عمدہ شعر کی کوئی ایسی منطقی تعریف غالباً ناممکن ہے جو تمام محاسنِ شعری پر حادی اور معائب کو اس سے دور رکھنے والی ہو، اس لئے کہ شعر میں مختلف طریقوں سے خوبیاں پیدا کی جاتی ہیں یا یوں کہئے کہ شعر کی خوبی کسی ایک بات پر منحصر نہیں ہے، کبھی مضمون کی بلندی اور علو شعر کو بہت بلند بنا دیتا ہے، کبھی صرف انداز بیاں کی خصوصیت سے شعر میں ایسی خوبی پیدا ہو جاتی ہے جو گھنٹوں آدمی کو پر کیف بنائے رکھتی ہے، حالانکہ مضمون اور خیال پامال ہوتا ہے، کبھی تناسب اور الفاظ کا برمحل بند و بست شعر کو سحر بنا دیتا ہے اور کبھی تخیل و محاکات کی طلسم کاریاں شعر کے سحر کو اعجاز کے درجہ تک پہونچا دیتی ہیں۔ الغرض کوئی ایک تعریف ممکن نہیں ہے۔

حضرۃ آسی کا کلام بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا یعنی اُن کے یہاں بھی ہر قسم کے شعر موجود ہیں، بعض بلندی خیال و پاکیزگی جذبات کا جامہ زیب بر کئے ہوئے ہیں، بعض انداز بیان کی جدت کی وجہ سے جاذب نظر ہیں اور بعض دوسری خوبیوں کے ساتھ مذاقِ سلیم کو دعوت کیف دیتے ہیں۔

ہم کوشش کریں گے کہ چند عنوانات کے ماتحت علیحدہ علیحدہ آسی مرحوم کے کلام پر تبصرہ کریں کیونکہ کسی کے کلام کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا غالباً یہ محفوظ اور بہتر طریقہ ہے۔ جیسا کہ ہم کسی دوسری جگہ اشارہ کر آئے ہیں۔ کلام آسی کی یہ بھی ایک خاص خوبی ہے کہ اُن کی غزلوں میں بھرتی کے شعر بہت کم ہوتے ہیں اور زیادہ تعداد ایسے شعروں کی ہوتی ہے کہ نگاہِ انتخاب بے اختیار اُن کے لئے اپنا دامن پھیلا دیتی ہے، چنانچہ دیوان آسی کی پہلی ہی غزل ایسی ہے جو ایک نقادِ سخن کو دعوت دے رہی

عشق کہتا ہے کہ عالم سے جدا ہو جاؤ
حسن کہتا ہے جدھر جاؤ نیا عالم ہے

بہار خلد ہے اندھوں کے واسطے شاید
کہ کچھ نظر نہیں آتا ہے چشم بینا کو

ملاحظہ فرمایئے کہ بلندیٔ خیال کی کیسی عدیم النظیر مثال ہے اور کس خوبی کے ساتھ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ پر محققانہ روشنی ڈالی ہے، فردوس اور اس بہاروں سے انکار ہی نہیں کرتے، مگر چشم حقیقت بیں کو وہ نظر ہی نہیں آتی کیونکہ شعر کے اندر اس کی کوئی دلیل نہیں دی، مگر چشم بینا میں جو وسعت ہے وہ اس مسئلہ کو حل کر دیتی ہے کہ بہشت اور اس کی بہار ظاہر پرستوں کے لئے ہے، چشم بینا کو تو حسن ازل کی نیرنگی بہار کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا اس علو خیال کے ساتھ حسن بیان کے مزے لیجئے جو پہلے مصرعہ سے پیدا ہو گیا ہے۔

نہ کبھی کے بادہ پرست ہم نہ ہمیں یہ کیف شراب ہے
لب یار چومے ہیں خواب میں وہی جوش مستی خواب ہے

دل مبتلا ہی ترا ہی گھر اسے رہنے دے کہ خراب کر
کوئی میری طرح تجھے مگر نہ کہے کہ خانہ خراب ہے

انہیں کبر حسن کی نخوتیں، مجھے فیض عشق کی حیرتیں
نہ کلام ہے نہ پیام ہے نہ سوال ہے نہ جواب ہے

دل عندلیب یہ شوق نہیں گل لالہ کے یہ ورق نہیں
مرے عشق کا وہ رسالہ ہے، ترے حسن کی یہ کتاب ہے

یہ اشعار جذبات کی رنگینی و رعنائی کی کیسی پُرکیف مثال ہیں، زبان کے ترنم اور انداز بیاں کی روانی و صفائی نے کس قدر دلآویزی پیدا کر دی ہے بالخصوص تیسرا اور چوتھا شعر کتنی مستانہ شگفتگی اپنے اندر رکھتے ہیں اور مذاق سلیم کی کیف پروری کا کس قدر سامان ان کے اندر موجود ہے۔

کسی نے لی رہ کعبہ کوئی گیا سوے دیر
پڑے رہے ترے بندے مگر ترے در پر

کچھ بھی نہ آرزو ہو یہ ہے دل کی آرزو
کوئی نہ مدعا ہو یہ ہے مدعائے دل

سوا تیرے نہ مائل ہو کسی پر دہ طبیعت دے
تری الفت ہو تیرا عشق ہو تیری محبت ہو

مری نظروں میں تو ہو ڈر ترا تیری محبت ہو
نہ دنیا ہو نہ عقبیٰ ہو نہ دوزخ ہو نہ جنت ہو

حرص دولت کی نہ عز و جاہ کی
تو تمنا ہے دل آگاہ کی

یہ سب شعر جذبات کی پاکیزگی و شگفتگی کی روشن مثالیں ہیں جن سے حضرت آسی کے مذاق فطرۃ کی بلندی و وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

سودائے ذوقِ جلوہ عبث ہے جب نظر نہیں | جلوہ تو بھر اہلِ نظر بیقرار ہے
ذوقِ ادا و ناز کہاں، بے خودی کہاں | اب تو شرابِ وصل بھی کچھ ناگوار ہے

ان شعروں سے بھی وسعت نظری کا کیف ٹپکتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ مذاقِ آسی صرف میخانۂ حقیقت کا سبوکش تھا۔

کہتے ہو کہ اور کو نہ چاہو | معلوم ہوا کہ تم خدا ہو
دل کا بھی جو کوئی آشنا ہو | کیا جانے وہ ہوتے ہوتے کیا ہو

سوز و گداز | وہ چیز جو شعر کو سحر اور سحر کو واقعی اعجاز کے قالب میں ڈھال دیتی ہے وہ سوز و گداز اور درد و تاثیر ہے یہ شعر کی ایسی خوبی اور ایسی صفت ہے کہ مشکل سے پیدا ہوتی ہے، مگر جس شعر میں یہ صفت موجود ہوتی ہے وہ بے پناہ ہوتا ہے۔ میر کی واقعی شہرت، بلند خیالی اور معنی آفرینی کے لئے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ان کا کلام درد و اثر اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے کہ سُنتے ہی نگہِ یار کی طرح دل میں جاکر پیوست ہو جاتا ہے۔

شعر کے اندر یہ خوبی تخیل و محاکات کی کرشمہ سازی سے پیدا ہوتی ہے، جو اندازِ بیاں کی صفائی و شگفتگی اور زبان کی سلاست و سادگی سے مل کر شعر کو خدا معلوم کیا بنا دیتے ہیں۔

بعض شعرا اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ شعر میں سوز و گداز کی کیفیت اِن الفاظ کے ذریعہ پیدا کی جا سکتی ہے جو اظہارِ غم کے لئے بنائے گئے ہیں یا جس لفظ کے ساتھ کیفیاتِ غم و اندوہ وابستہ ہیں، مثلاً میت، لاش، لحد، نزاع، موت، یاد درد، غم، رنج، صدمہ وغیرہ یہ الفاظ اور اُن کے متعلق مضامین نظم کر دینے سے شعر میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ موجودہ شعرا لکھنؤ میں سے بعض عمدہ کہنے والے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اور بعض ایسے شعر میرے حافظہ میں محفوظ ہیں، جن میں میت، لحد، نزاع، موت یہ سب لفظ جمع ہو گئے ہیں مگر وہ بجائے موثر ہونے کے بھیانک ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سوز و گداز کے لئے اول تو جذبہ ہی ایسا چاہیئے، جو دلگداز ہو اور اس کو جس قدر لطیف کنایہ میں ادا کیا جائے گا اسی قدر وہ موثر ہوگا۔ میر کے یہاں یہی بات ہے کہ وہ صحیح درد انگیز

جذبات کسی ایسے لطیف کنایہ میں تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ فوراً سامع اس کیفیت کو محسوس کرنے لگتا ہے جو شعر میں بیان کی گئی ہے، مثال کے طور پر ہم یہاں چند شعر میر کے لکھتے ہیں۔

اب حال دل ہے اُن کے دیکھو ۔ کیا پوچھتے ہو الحمد للہ

کس قدر بے پناہ شعر ہے، ملاحظہ فرمایئے کہ اس شعر میں ایک لفظ بھی ان الفاظ میں سے نہیں ہے جو اوپر لکھے گئے، مگر کتنی دلسوز آگ اس کے اندر بھری ہوئی ہے، جس کے پڑھتے ہی قلب و جگر سے دُھواں سا اُٹھنے لگتا ہے اور ملاحظہ فرمایئے۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا ۔ دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

میرے تغیّر حال پر مت جا ۔ اتفاقات ہیں زمانہ کے

اس شعر میں بھی کتنی چنگاریاں دل و جگر کے پھونکنے کے لئے بھری ہوئی ہیں، حالانکہ ایک لفظ بھی اس قبیل کا نہیں ہے جن سے غم و اندوہ کی کیفیات متعلق ہوتی ہیں، مگر دوسرا مصرعہ نوکِ تیر سے صفحۂ دل پر اس ماجرائے خستہ حالی اور داستانِ غم کو لکھ رہا ہے جو "تغیّر حال" میں مخفی ہے۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ ۔ نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

کہتا تھا کسی سے کچھ تکتا تھا کسی کا منہ ۔ کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا

پہونچا تو ہوگا سمع مبارک میں حال میر ۔ اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگایئے

صرف مثال کے لئے ایک دو شعر لکھنا چاہتا تھا مگر کمبخت میر کا نام آیا کہ حافظہ نے اپنی دولت مسرفانہ طریق پر لٹانی شروع کر دی۔ بہرحال ان شعروں سے اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا کہ سوز و گداز شعر کے اندر کیونکر پیدا ہوتا ہے۔

میر کے علاوہ بھی اس رنگ کے ایک دو شعر سُن لیجئے کہ خالی از لطف نہ ہوں گے۔

منشی امیر اللہ تسلیم فرماتے ہیں۔

کسے خبر ہے جو دل پر گذر گئی تسلیم ۔ مرا فسانہ مرے بعد کیا بیان ہوگا

کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ تسلیم کے دل پر کیا گذر گئی اُف کتنی غمناکیاں اور کس قدر دردانگیزیاں اس شعر میں تسلیم نے بھر دی ہیں کہ شعر پڑھتے ہی کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے، حالانکہ مذکورہ بالا قسم کا

کوئی لفظ موجود نہیں ہے سودا کا ایک شعر ہے

مت پوچھ یہ کہ رات کٹی کیونکہ تجھ بغیر — اس گفتگو سے فائدہ پیارے، گذر گئی

دیکھئے اس "گذر گئی" کے اندر کتنی بیقراریاں پوشیدہ ہیں۔ حالانکہ درد و اضطراب کا کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ اساتذہ کے یہ اشعار یہاں نقل کرنے میں میں نے غلطی کی کیونکہ ان شعروں کے بعد شاید آسی کے اشعار میں وہ کیف نظر نہ آئے مگر تنقیدی نقطۂ نظر سے یہ اچھا ہے کیونکہ اس سے یہ حقیقت نمایاں ہو جائے گی کہ آسی کا کلام واقعتاً کس درجہ اور مرتبہ کا ہے۔

آسی چونکہ فطرت کی طرف سے ذوقِ صحیح لے کر آئے تھے اس لئے وہ شعر کے اس رازِ سوز و گداز سے بھی واقف تھے، آپ دیکھیں گے کہ ان کے کلام میں بھی سوز و گداز کی کیفیت اسی رنگ میں آپ کو ملے گی، جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

نہیں ہوتا کہ بڑھ کر ہاتھ رکھ دیں — تڑپتا دیکھتے ہیں دل ہمارا
اگر قابو نہ تھا دل پر بُرا تھا — وہاں جانا سرِ محفل ہمارا

پہلا شعر کس قدر خوبی کا ہے اور کتنا پُر حیرت۔

وہاں پہونچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد — کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

ملاحظہ فرمائیے، دوسرا مصرعہ کتنا پُر درد ہے و غم آفریں کیفیات کو ظاہر کر رہا ہے۔

یہ حالت ہے تو شاید رحم آجائے — کوئی اس کو دکھا دے دل ہمارا

کیا اور کیسی حالت ہے یہ کچھ نہیں بتلایا مگر ناممکن ہے کہ آپ یہ نہ محسوس کر لیں کہ حالت قابلِ رحم ہے، شاید کا لفظ کتنا لطف دے رہا ہے۔

بلے ترے جینے کی کس جی سے تمنا کرتے — مر نہ جاتے جو شبِ ہجر تو ہم کیا کرتے

اس شعر میں ردیف و قافیہ نے جان ڈال دی ہے جو اس شعر کے سوز و گداز کا مدخل و مخرج ہے۔

شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ اس شعر میں تو مرنے اور جینے کے لفظ موجود ہیں سو واضح رہے کہ میں نے قصداً اس شعر کا انتخاب اس لئے کیا ہے تاکہ یہ غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے کہ کیفیاتِ غم کو ظاہر کرنے والے الفاظ سوز و گداز پیدا کر ہی نہیں سکتے، کیونکہ یہ تو بداہتہً غلط ہوگا اور مراثی میں تو اس کا

استعمال ناگزیر ہے، چنانچہ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے یہاں اسی لئے شاہد عادل ہیں اور شاید اسی مرثیہ گوئی کے فضا سے متاثر ہو کر موجودہ شعرائے لکھنؤ نے تغزل میں بھی سوز و گداز کے لئے اس کو ضروری سمجھ لیا ہے، بہرحال میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ محض ایسے الفاظ کے اجتماع سے شعر میں سوز و گداز نہیں پیدا ہو سکتا اور نہ اس میں وہ لطافت پیدا ہو سکتی ہے جو کنایہ میں ہوتی ہے، لیکن اگر خود جذبات فی حد ذاتہٖ پرسوز و پرغم ہوں اور خواہ مخواہ ضرورت سے زیادہ اور کثرت سے ان الفاظ کا استعمال نہ کیا جائے بلکہ صرف ناگزیر درجہ پر تناسب سے ساتھ بلا قصد و کوشش ایسے لفظ آجائیں تو شعر میں یقیناً خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً

کسی در پر پڑا رو رو کے آسی رات کہتا تھا	کہ آخر میں تمہارا بندہ ہوں تم بندہ پرور ہو

اس شعر میں "رو رو" کا لفظ کس قدر اظہار کیفیت کر رہا ہے۔

بھلا کس دل سے ہم انکار درد عشق کرتے ہیں	نہیں کچھ ہے تو کیوں رہ رہ کے دل پر ہاتھ دھرتے ہیں

ظاہر میں تو کچھ چوٹ نہیں کھائی ہے ایسی	کیوں ہاتھ اٹھایا نہیں جاتا ہے جگر سے

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے او باد صبا	یادگار رونق محفل تھی پروانہ کی خاک

یہ سب شعر سوز و گداز کی لاجواب مثالیں ہیں خصوصاً آخری شعر تو خدا جانے کس قدر کیفیات سوز و گداز سے معمور ہے۔ (باقی)

غزل

گلچیں نہیں کہ پھول سر گلستاں نہیں	سب کچھ ہے لیکن ایک مرا آشیاں نہیں
اے موت صبر کر کہ ہوں سرگرم انتظار	مجھ کو ابھی ضرورتِ خواب گراں نہیں
جو دل میں ہے وہ دل میں رہیگی تمام عمر
دنیا میں کوئی راز، مرا رازداں نہیں

راز

ولادت و ہجرت نبوی کی صحیح تاریخ

(ہیئت کے نقطۂ نظر سے)

اس میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ کی ولادت کس تاریخ کو ہوئی اور کس تاریخ کو آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، لیکن مصر کے ایک مشہور ہیئت داں محمود پاشا فلکی نے اس موضوع پر حد درجہ تحقیق کے ساتھ ایک رسالہ لکھ کر نہایت عالمانہ طریقہ پر ولادت و ہجرت کی صحیح تاریخیں متعین کر دی ہیں، جس میں اب ذرا بھی شبہ باقی نہیں رہتا۔

چونکہ ولادتِ نبوی کا مسئلہ نہایت اہم ہے اور خاصکر اُن لوگوں کے لئے جو محفل میلاد منعقد کرتے ہیں، اس لئے ہم اس رسالہ کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ ولادت نبوی کی صحیح تاریخ ۹۔ ربیع الاول ہے نہ کہ ۱۲۔ ربیع الاول۔

تاریخ ولادت رسول اللہ کی تاریخ ولادت متعین کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام روایات نقل کر دی جائیں جو تاریخ ولادت کے متعلق مروی ہیں۔

صاحب سیرت حلبی لکھتے ہیں کہ قتادہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دوشنبہ کے متعلق سوال کیا گیا تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ یہ وہ دن ہے جس میں میں پیدا ہوا ہوں۔ ابن بکار اور حافظ ابن عساکر کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت، طلوع فجر کے وقت ہوئی ہے، چنانچہ اس پر عبد المطلب کا یہ قول بھی دلالت کرتا ہے کہ "آج صبح کے وقت میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا" (ولد لی اللیلۃ مع الصبح مولود)

سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ آنحضرت دوپہر کے وقت اس دنیا میں تشریف لائے، ربیع الاول کی بارھویں تاریخ تھی اور موسم بہار کا تھا۔

اس روایت پر تقریباً لوگوں کا اجماع ہے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضور سرور عالم، دسویں ربیع الاول کو جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ حافظ دمیاطی اس روایت کی تصحیح کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ

۱۷۔ ربیع الاول کو حضور پیدا ہوئے اور بعض ۸۔ ربیع الاول کو تاریخ ولادت قرار دیتے ہیں۔ ابن دحیہ کہتے ہیں کہ آٹھویں ربیع الاول کی روایت کے سوا کوئی روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔ اور اسی پر اہلِ تاریخ کا اجماع ہے۔

روایات مذکورہ بالا کی بنا پر آنحضرت کی ولادت فصل ربیع میں آٹھ، دس، بارہ یا سترہ ربیع الاول قرار پاتی ہے۔ اگرچہ اِن اختلافات کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں، مگر چونکہ اختلافات مذکورہ کے راوی ثقات ہیں اور قابلِ اعتبار طرق سے یہ روائتیں مروی ہیں اس لئے ہم صرف انہیں پر اکتفا کرتے ہیں۔

اربابِ سیر کا بیان ہے کہ آپؐ حضرت حلیمہؓ کے پاس رہتے تھے اور انہیں کا دودھ پیتے تھے، جب آپ کی عمر دو برس کی ہوئی تو حضرت حلیمہ آپ کو آپؐ کی والدہ کے پاس مکہ لائیں اور اُن سے کہا کہ اب کی سال اس بچہ کو ہمارے پاس اور چھوڑ دو، کیونکہ مجھے مکہ کی وبا سے خوف ہے کہ کہیں نقصان نہ پہونچ جائے۔ حضرت حلیمہ کے اصرار سے جناب آمنہ نے اجازت دیدی اور وہ حضور کو اپنے قبیلہ میں واپس لے آئیں اور واپسی کے دو یا تین مہینہ بعد وہ واقعہ ہوا ہے جس کو عام طور سے شق صدر کہتے ہیں۔

سیرۃ حلبی میں اسی موقع پر لکھا ہے کہ مکہ سے واپس آنے کے بعد حضرت حلیمہ آپ کو کہیں دُور جانے نہیں دیتی تھیں۔ ایک دن انہیں خیال نہیں تھا، آپ کہیں چل دئے، دوپہر کا وقت تھا جب حضرت حلیمہ آپ کی تلاش میں نکلیں تو دیکھا کہ آپ کی ایک رضاعی بہن شیما گود میں لئے ہوئے کھلا رہی ہیں، یہ دیکھ کر حضرت حلیمہ نے کہا کہ "اس گرمی میں! یعنی اس گرمی کے وقت تم یہاں کھیل رہی ہو؟"

اِن دونوں روائتوں کے جمع کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جب حضرت حلیمہ آنحضرت کو جناب آمنہ کے پاس سے واپس لے گئیں، اس وقت حضور کی عمر دو سال کی تھی اور واقعۂ شق صدر دو سال دو مہینہ یا تین مہینہ کی عمر میں ہوا اور جس وقت آپ کی بہن آپ کو دوپہر کے وقت باہر لے گر گئی تھیں اس وقت آپ کی عمر دو سال سے کم اور دو سال تین مہینہ سے زیادہ نہ تھی۔

اب اگر اس وقت حضور کی عمر دو سال کی تھی اور وہ موسم گرمی کا تھا تو ظاہر ہے کہ آپ کی ولادت موسم گرما میں ہوئی، اور اگر دو سال تین مہینہ کی عمر تھی تو صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ موسم بہار میں پیدا ہوئے چونکہ عرب گرم ملک ہے اور اس میں بہار ہی کی اواخر سے بلکہ بعض وقت وسط بہار کے موسم سے گرمی

شروع ہو جاتی ہے اِس لئے بہار کے موسم میں ولادت کا احتمال پہلی صورت میں بھی (یعنی جبکہ آپ کی عمر دو سال کی مانی جائے) زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔

امام شمس الدین محمد بن سالم کتاب الجفر الکبیر میں لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ربیع الاول کے مہینہ میں ۲۰ نیسان سنہ ۱ عام الفیل کسریٰ نوشیرواں کے عہد میں ہوئی ہے، چونکہ نیساں کا مہینہ ہمیشہ اپریل کے مطابق رہتا ہے اِس لئے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی ولادت موسمِ بہار میں ہوئی۔

مسعودی، مروج الذہب میں لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت واقعۂ فیل سے پچاس روز بعد ہوئی ہے اور واقعۂ فیل ۷ المحرم سنہ ۸۸۲ سکندری بروز دوشنبہ واقع ہوا تھا اور اس وقت نوشیرواں کو حکومت کرتے ہوئے چالیس سال گذرے تھے اور آنحضرت کی ولادت اسی سال ۸ ربیع الاول کو مکہ میں ہوئی۔

روایت مسعودی کی بنا پر حساب لگانے اور عیسوی تاریخ سے مطابق کرنے سے آنحضرت کی ولادت سنہ ۵۷۱ء میں قرار پاتی ہے۔

موسیو کوسان، اپنی کتاب تاریخ عرب کے حصہ دوم میں ۲۸۳ صفحہ پر تاریخ الخمیس کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ نوشیرواں نے ۴۷ سال ۸ مہینے حکومت کی ہے اور مورخین روم نے بھی تقریباً یہی مدت لکھی ہے، فرق صرف ایک مہینہ کا ہے۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ کسریٰ نوشیرواں، حضور کی ولادت کے بعد ۷ سال ۸ مہینہ زندہ رہا۔ لہٰذا اِس حساب سے نوشیرواں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت پورے چالیس سال حکومت کر چکا تھا، اور چونکہ یہ بادشاہ سنہ ۵۳۱ء میں تخت پر بیٹھا ہے، لہٰذا اِس سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سنہ ۵۷۱ء میں ثابت ہوتی ہے۔

جرجس معروف بہ ابن عمید نے مختصر التواریخ میں تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسریٰ کی وفات کے وقت ۸ سال کے تھے۔ چونکہ اس بادشاہ کی وفات سنہ ۵۷۹ء میں ہوئی ہے لہٰذا اِس حساب سے بھی حضرت کی ولادت سنہ ۵۷۱ء میں ثابت ہوتی ہے۔

اڈیٹر رسالہ کرد نولوجیا الریاضیہ نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۲۲ نیسان سنہ ۸۸۲ سکندری کو پیدا ہوئے ہیں۔ چونکہ نیساں (جو سُریانی مہینہ کا نام ہے) اپریل کے مطابق ہے، لہٰذا اِس سے بھی

آنحضرت کی ولادت ۲۲ر اپریل ۵۷۱ء میں ثابت ہوتی ہے۔

موسیو سیلوسٹر و ساسی لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۲۰ر نیسان ۸۸۲ء سکندری دوشنبہ کی رات کو ہوئی ہے اس بیان سے بھی ولادت ۲۰۔ اپریل ۵۷۱ء کو قرار پاتی ہے۔

مشرق کے علمائے ہیئت کا اس پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی ہے اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ولادت مشتری اور زحل کے قرآن کے بعد ہوئی ہے اور یہ قرآن، برج عقرب میں ہوا تھا۔

موسیو بووارڈ کی زیچ پر حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپریل ۵۷۱ء کی پہلی تاریخ کو مشتری برجِ عقرب میں، ۲ درجہ، ۱۵، دقیقہ پر تھا اور زحل ۷، درجہ، ۱۵ دقیقہ پر برج مذکور میں تھا اور اس وقت یہ دونوں سیارے حالتِ رجوع میں تھے، اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قران، ۲۹ یا ۳۰ مارچ کو واقع ہوا تھا۔ اس قران کو مشرق کے علمائے ہیئت قران الملۃ یا قرآن ملتِ اسلام کہتے ہیں اس کے متعلق بعض مشرقی علمائے ہیئت کے اقوال ملاحظہ ہوں:۔

یحییٰ بن ابی شکر مغربی، اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں کہ ولادت آنحضرت کی عام الفیل میں واقع ہوئی ہے اور یہ ۸۸۲ء سکندری تھا اور اسی سال زحل اور مشتری کا قران برج عقرب میں ولادت سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے واقع ہوا تھا، اس حساب سے بھی ولادت ۳۰۔ مارچ ۵۷۱ء کے بعد ثابت ہوتی ہے۔

صاحب منتہی الادراک لکھتے ہیں۔ "اس قران کے پہلے سال میں ولادت ہوئی ہے" سابقہ بیان سے ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ قران ۲۹ یا ۳۰ مارچ ۵۷۱ء میں واقع ہوا تھا اس لئے اس حساب کی رو سے بھی ولادت ۵۷۱ء میں ثابت ہوتی ہے۔

صاحب کتاب الکامل اسرار النجوم میں اور شیخ احمد بن عبدالجلیل کتاب القرانات میں بھی اسی طرح لکھتے ہیں ان تمام شہادتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور سرور عالم صلعم کی ولادت باسعادت ۵۷۱ء میں ۲۹ر مارچ کے تھوڑے عرصہ کے بعد ہوئی ہے اور ۲۹ یا ۳۰ مارچ کا دن، زحل اور مشتری کے قران کا ہے کا، جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔

مسعودی اور مصنف مجمل التواریخ وغیرہ لکھتے ہیں کہ آنحضرت کی ولادت نوشیرواں کے سنہ ۴۲ جلوس میں

میں ہوئی تھی اور بعض مورخین مثل حمزہ اصفہانی وغیرہ کہتے ہیں کہ ولادت سنہ ۴۱ جلوس نوشیرواں میں ہوئی ہے، لیکن یہ دونوں روائتیں اس طرح جمع ہو سکتی ہیں کہ ان مورخین نے یوم ولادت کو چونکہ معین نہیں کیا ہے۔ اس لئے جو لوگ سنہ ۴۰ کے قائل ہیں، انھوں نے ولادت کو سنہ ۴۰ کے آخری دنوں میں خیال کیا ہے اور جو سنہ ۴۱ قرار دیتے ہیں وہ سنہ ۴۱ کے اوائل میں خیال کرتے ہیں، لہذا ان دونوں روائتوں میں اگر فرق ہوگا تو ایک دو مہینہ سے زیادہ نہ ہوگا، پس اس صورت میں بھی سنہ ۵۷۱ء سال ولادت قرار پاتا ہے۔

ان تمام مختلف بیانات سے اس متحدہ نتیجہ پر ہم پہونچ سکتے ہیں کہ آفتاب رسالت کا طلوع فصل بہار سنہ ۵۷۱ء میں ہوا ہے اور چونکہ بعض اقوال سے اس کی تصریح ہوتی ہے کہ ولادت اپریل کے مہینہ میں واقع ہوئی ہے اور بعض روایات نہایت زور سے اس پر دلالت کرتی ہیں اس لئے ہم اپریل سنہ ۵۷۱ء کو ماہ ولادت قرار دیتے ہیں اور اس سے عربی تاریخ اور دن اس طرح معلوم کرتے ہیں۔

آفتاب اور ماہتاب کا اجتماع حقیقی عرض مکہ کے اعتبار سے ۱۱ اپریل سنہ ۵۷۱ء کو ۹ بجکر ۴۱ منٹ پر ہوا ہے اور اسی روز شام کے وقت ہلال، افق مشرق پر نظر آیا ہے، لہذا ربیع الاول کی پہلی تاریخ اتوار کے دن ۱۲ اپریل کو ہوئی ہے۔ اور قابل اعتبار روایتوں میں ۸، ۱۰ یا ۱۲ ربیع الاول کو یوم ولادت بتایا گیا ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ولادت دوشنبہ کے دن ہوئی ہے۔ پھر چونکہ ۸، ۱۰ اور ۱۲ تاریخ کے درمیان دوشنبہ کا دن صرف ۹ ربیع الاول کو واقع ہوتا ہے اس لئے ہم ۹ تاریخ کو یوم ولادت قرار دیتے ہیں، اسی کو صحیح سمجھتے ہیں اور یقین سے کہتے ہیں کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے دن ۹ ربیع الاول مطابق ۲۰۔ اپریل سنہ ۵۷۱ء کو پیدا ہوئے۔

ہجرت | حافظ ناصر الدین، ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ "جس روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لے گئے تو وہاں کے یہودی روزہ سے تھے، دریافت سے معلوم ہوا کہ یہودی کہتے ہیں کہ آج کے دن خدا نے حضرت موسیٰ کو فرعون سے نجات دی تھی اور فرعون کو غرق کیا تھا حضور نے فرمایا کہ یہودیوں کی بہ نسبت ہم اس روزہ کے زیادہ مستحق ہیں"۔ یہ حدیث صحیح ہے اور اس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

اسلامی اصطلاح کے بموجب عاشورہ، دسویں محرم کا ہوتا ہے، لیکن اس صورت میں یہ حدیث

اُس روایت سے متناقض ہوگی جس میں تصریح ہے کہ ہجرت، ربیع الاول کے مہینہ میں واقع ہوئی تھی اور اس مضمون کی اور روایتیں بھی آئی ہیں اور وہ سب صحیح مانی گئی ہیں، لہذا اس کے لئے ہم کو چاہئے کہ اس مسئلہ پر غور کریں کہ عاشورہ، دسویں محرم کے علاوہ عہد نبوت میں کسی دوسرے دن کو بھی کہتے تھے یا نہیں اور اس اشکال کے حل ہو جانے کے بعد تاریخ ہجرت کی تعیین آسان ہو جائے گی۔

صاحب سیرت حلبی کہتے ہیں کہ "اگر یہ کہا جائے کہ جس روز آنحضرت نے ان کو روزہ رکھے ہوئے دیکھا وہ عاشورہ کا دن تھا، تو اس میں ایک زبردست اشکال پیش آتا ہے کیونکہ عاشورہ، محرم کے دسویں دن کو کہتے ہیں اس لئے وہ ربیع الاول میں کس طرح واقع ہو سکتا ہے، اس کے بعد خود صاحب سیرت اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہودیوں کے یہاں شمسی سال کا استعمال ہوتا تھا قمری کا نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ عاشورے کا دن جس سے اتفاقاً غرق فرعون کا دن بھی مطابق ہو گیا تھا، ہمیشہ دسویں محرم کے ساتھ مطابق نہیں رہ سکتا، بلکہ یہ ایک محض اتفاق تھا کہ جب آنحضرت تشریف لے گئے تو دونوں دن مطابق تھے اور اگر وہ حقیقت میں عاشورے کا دن ہوتا تو آپ کو سوال کرنے کی ضرورت نہ ہوتی"

بیان مذکور کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ طبرانی، معجم کبیر میں لکھتے ہیں کہ "عاشورہ وہ دن نہیں ہے جس میں کعبہ کو غلاف پہنایا جاتا ہے اور حبشی آنحضرت کے سامنے کھیلتے تھے، بلکہ یہ دن تو سال بھر میں پھرا کرتا تھا لوگ اس کے متعلق فلاں یہودی سے پوچھ لیا کرتے تھے، اور جب وہ مر گیا تو زید بن ثابت سے پوچھنے لگے"

بیرونی، کتاب الآثار میں لکھتا ہے کہ "ایک قول یہ بھی ہے کہ لفظ عاشورہ، عبرانی ہے اور یہ یہود کے مہینہ تشری کا دسواں دن ہے اور اس کا روزہ صوم الکبور کہلاتا ہے، عربوں نے بھی اپنے مہینوں میں اس کا اعتبار کر لیا اور جس طرح عاشورہ یہودیوں کے پہلے مہینے یعنی تشری کے دسویں دن کا نام تھا، اسی طرح عرب اپنے پہلے مہینہ یعنی محرم کے دسویں دن کو عاشورہ کہنے لگے، مذکورہ بالا بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۱۰ تشری کو مدینہ میں داخل ہوئے۔ توراۃ کی رو سے اس دن کا روزہ رکھنا فرض ہے اور آج تک یہودی اس دن کا روزہ رکھتے ہیں"

ہمارے خیال میں یہ نتیجہ بالکل صحیح ہے اور جو روایات میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے دن مدینہ میں داخل ہوئے یہ بھی بالکل درست ہے۔ اب ہم کو عیسوی تاریخ کی مطابقت کے لئے یہ دیکھنا

چاہیئے کہ ۱۰ اتشری کو جو یہودی کے سال کا دسواں دن ہے کون سا دن تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہجرت، سنہ ۶۲۲ء میں واقع ہوئی ہے، حساب کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دس تشری ۲۰ ستمبر سنہ ۶۲۲ء کے مطابق تھا۔ اور اس روز قمری مہینہ کی آٹھویں تاریخ تھی، کیونکہ شمس و قمر کا اجتماع ۱۱ ستمبر، شنبہ کے دن تھا اور ہلال کی تولید نصف اللیل کے بعد ہوئی تھی اس لئے خالی آنکھ سے ہلال اتوار کی شام کو نظر آیا ہوگا۔ اور اس حساب سے ۱۳ ستمبر کو قمری مہینے کی پہلی تاریخ ہوتی ہے اور چونکہ ہجرت ۲۰ ستمبر کو واقع ہوئی ہے اس لئے اس دن چاند کی ۸ تاریخ تھی۔

اربابِ سیر اور راویانِ احادیث کا اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس تاریخ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ بعض دوسری، بعض آٹھویں اور بعض بارہویں ربیع الاول بتاتے ہیں، ہمارے نزدیک صحیح تاریخ وہی ہو سکتی ہے جو دوشنبہ کے دن واقع ہو، چونکہ حساب کی رو سے دوسری اور بارہویں کو دوشنبہ واقع نہیں ہوتا، بلکہ آٹھویں ربیع الاول کو واقع ہوتا ہے، اس لئے یہی صحیح ہے۔

اس تمام تحقیق سے یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ ہجرت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ میں داخلہ ۸ ربیع الاول مطابق ۲۰ ستمبر سنہ ۶۲۲ء موافق ۱۰ اتشری سنہ ۴۳۸۳ (پیدائش) کو واقع ہوئی ہے۔

حدیث مذکور جس میں یہ ذکر ہے کہ جب آنحضرت مدینہ میں داخل ہوئے تو یہودیوں کا روزہ تھا، بخاری اور مسلم میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، جو اس حدیث کے صحیح ہونے کی نہایت روشن دلیل ہے، لیکن بعض روایات میں ایک اضافہ بھی ہے جو بیان توریت کے خلاف ہے، اضافہ یہ ہے "حضور نے فرمایا کہ آج کون سا دن ہے لوگوں نے عرض کیا کہ آج کے دن خدا نے فرعون کو غرق کیا ہے اور موسیٰ کو نجات دی ہے" یہ اضافہ یہودیوں کی کتاب کے خلاف ہے، کتاب یہود میں لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بحر احمر کو ۲۱ نیسان کے دن عبور کیا تھا اور ۲۱ نیسان کا دن یہودیوں کی عید الفصح کے سات دن بعد واقع ہوتا ہے، اس لئے یہ حدیث توریت کے موافق نہیں ہے، لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے وہی روایت کیا ہے جو انہوں نے یہودیوں سے سنا تھا یا انہیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پس اضافہ بہ لحاظ روایت کے صحیح ہے اور حقیقت میں غلط ہے کیونکہ یہودیوں کی جہالت تھی کہ وہ اس روزہ کا سبب غرق فرعون اور نجات موسیٰ سمجھتے تھے۔ لہذا توریت کا بیان اور حدیث کی روایت دونوں صحیح ہیں، بخاری کی ایک روایت میں یہ اضافہ بالکل نہیں ہے

امام بخاری یہ روایت اس طرح کرتے ہیں۔

عن ابی موسیٰ الاشعری قال دخل النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ واذا ناس من الیہود یعظمون عاشوراء ویصومونہ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم نحن احق بصومہ فامر بصومہ۔

ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ) یہودی لوگ عاشورا کی عظمت کرتے ہیں، اس کا روزہ رکھتے ہیں، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم اس روزہ کے زیادہ مستحق ہیں پھر آپ نے اس روزہ کا حکم دیا۔

بعض لوگ چونکہ حقیقت سے واقف نہیں ہیں اور عاشورے کے معنے نہیں سمجھتے وہ خیال کرتے ہیں کہ ہجرت، دسویں محرم کو واقع ہوئی ہے اور دسویں محرم دس تشری کے مطابق تھا۔ بیرونی نے کتاب الآثار میں تصریح کر دی ہے کہ ۱۰ محرم اور ۱۰ تشری اس سال میں کسی طرح مطابق نہیں ہو سکتے بیرونی لکھتا ہے:

"یہ روایت کی گئی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورہ کا روزہ رکھے ہوئے ہیں، آپ نے اس کے متعلق دریافت کیا تو لوگوں نے کہا کہ یہ وہ دن ہے، جس روز خدا نے فرعون کو غرق کر دیا تھا اور موسیٰ کو نجات دی تھی، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم زیادہ مستحق ہیں اور آپ نے صحابہ کو عاشورہ کا روزہ رکھنے کا حکم دیا، جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپ نے نہ اس کے متعلق حکم دیا اور نہ منع فرمایا" یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ سال ہجرت میں پہلی محرم، جمعہ کے دن واقع ہوئی تھی اور تموز (۹۳۳ سکندری) کی ۱۶ ار تاریخ تھی، اور اس سال یہود کی سال کا پہلا دن یکشنبہ ۱۲۔ ایلول اور ۲۹ صفر کے مطابق تھا اس حساب سے عاشورہ (۱۰ تشری) کا روزہ ۔ ۹ ربیع الاول کو واقع ہوتا ہے۔ اور یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت ربیع الاول کے نصف اول میں واقع ہوئی ہے اور دن دوشنبہ کا تھا کیونکہ جب آپ سے دوشنبہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ وہ دن ہے جس روز میں پیدا ہوا، مبعوث ہوا، اور مجھ پر وحی نازل ہوئی اور میں نے ہجرت کی۔

اس میں اختلاف ہے کہ کون سے دوشنبہ کے دن ہجرت واقع ہوئی ہے، بعض کہتے ہیں کہ ۲۔ ربیع الاول کی دوشنبہ کو واقع ہوئی اور بعض آٹھویں کے دوشنبہ کو اور بعض بارہویں ربیع الاول

دوشنبہ کو بتاتے ہیں لیکن آٹھویں تاریخ پر زیادہ اتفاق ہے کیونکہ دوسری اور بارہویں کو دوشنبہ واقع نہیں ہوتا، اس لئے کہ پہلی ربیع الاول دوشنبہ کے دن تھی لہذا ہمارے اس بیان کی بنا پر مدینہ میں آنحضرت کا داخلہ عاشورۂ یہود سے ایک روز پہلے ہوتا ہے (کیونکہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ سال ہجرت میں یہودیوں کی سال کا پہلا دن اتوار کے روز تھا اس لئے اتوار کو ۸، پیر کو ۹۔ اور منگل کو دس ہوتی ہے۔)

اس تاریخ کی مطابقت سال ہجرت میں محرم کی دسویں سے نہیں ہو سکتی بلکہ (سال ہجرت سے چند سال پہلے) اور بیس برس سے زیادہ عرصہ کے بعد مطابق ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ راویوں کا یہ کہنا کہ اس روز خدا نے فرعون کو غرق کیا تھا صحیح نہیں، کیونکہ توریت اس کے بالکل خلاف ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ واقعۂ مذکورہ ۲۱ نیساں کو واقع ہوا ہے اور وہ ایام فطیر کا ساتواں دن تھا اور فصح یہود کا پہلا دن۔ آنحضرت کے مدینہ تشریف لانے کے بعد سہ شنبہ ۲۲۔ آذر ۹۳۳ سکندری کے مطابق تھا اور جس روز خدا نے فرعون کو غرق کیا وہ ۲۳ رمضان کا دن تھا اس لئے روایت مذکورہ کی کوئی وجہ صحت نہیں ہو سکتی۔"

یہ سب کچھ بیرونی کا بیان تھا، بیرونی نے اس روایت سے تین مقدمے اخذ کئے ہیں (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں عاشورائے یہود کے دن داخل ہوئے (۲) یہ دن مسلمانوں کے عاشورے کا دن بھی تھا (۳) اور اسی دن خدا نے فرعون کو غرق کیا۔

اس کے بعد بیرونی نے ان تینوں مقدموں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یعنی وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ سال ہجرت میں دونوں عاشورے مطابق تھے، یعنی عاشورائے یہود سہ شنبہ کے دن تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے دن مدینہ میں داخل ہوئے اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ دن غرقِ فرعون اور نجات موسیٰ کا تھا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو بیرونی کے استدلال سے حدیث کی عدم صحت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ دونوں عاشوروں (عاشورائے یہود اور عاشورائے عرب) کا مطابق نہ ہونا حدیث کی عدم صحت پر دلالت نہیں کرتا اس لئے کہ حدیث میں مطابقت کا دعوٰی ہی نہیں کیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ عدم مطابقت سے ان لوگوں کے خیال کی تغلیط ہوتی ہے، جو سمجھتے ہیں کہ حدیث سے مطابقت مفہوم

دن ہوتی ہے۔ اور بیرونی کا یہ قول کہ عاشورائے یہود سہ شنبہ کے دن تھا اور آنحضرت کا داخلہ دوشنبہ کے دن ہوا ہے یہ بھی غلط ہے کیونکہ صحیح حسابات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سالِ ہجرت میں یہودیوں کے سال کا پہلا دن ۱۱ر ایلول (۱۱ ستمبر یا ۲۹ صفر) کو اتوار کے دن تھا۔ ۱۲ر ایلول کو نہ تھا، جیسا کہ بیرونی کا خیال ہے۔ لہذا عاشورا یا ۱۰ تشری، دوشنبہ آٹھ ربیع الاول کے مطابق ہے سہ شنبہ ۹ ربیع الاول کے مطابق نہیں ہے۔

اب رہا بیرونی کا یہ خیال کہ یومِ ہجرت، یومِ غرقِ فرعون کے مطابق نہ تھا، کیونکہ توریت میں اس کے خلاف تصریح موجود ہے، اس سے بھی روایت کی تغلیط نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ روایت کی غلطی نہیں ہے بلکہ یہودیوں کا یہ خیال کہ اس دن خدا نے فرعون کو غرق کیا ہے بجنسہ روایت کر لیا گیا ہے اس لئے اگر غلط ہے تو ان کا خیال غلط ہے، نفس روایت غلط نہیں ہو سکتی۔

تحقیق مذکورۂ بالا کے علاوہ اور طریقوں سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مدینہ میں آنحضرت کا داخلہ ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء مطابق ۱۰ تشری کو تھا اور یہی یہودیوں کا عاشورا تھا۔

(۱) مسعودی، مروج الذہب میں لکھتا ہے کہ تاریخ یزدجرد اور ہجرت کے درمیان ۳۶۲۴ دن کا فرق ہے اس پر اتفاق ہے کہ آنحضرت کا داخلہ مدینہ میں پہلی محرم کے ۶۷ دن بعد ہوا اس لحاظ سے تاریخ ہجرت اور تاریخ یزدجرد میں ۳۶۲۴ دن کا فرق ہے (۳۶۲۴ - ۶۷ = ۳۵۵۷) اور چونکہ تاریخ یزدجرد کی ابتدا ۱۶ جولائی ۶۳۲ء کو ہوتی ہے (یعنی آنحضرت کی وفات کے ۸ یا ۹ دن بعد) اس لئے اس تاریخ سے ۶۷ دن پیچھے شمار کرنے سے یوم ہجرت نکل سکتا ہے اور وہ ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء دوشنبہ کا دن ہے۔ اور یہی داخلۂ مدینہ کا دن ہے۔ اور یہودی تاریخ کے حساب سے ۱۰ تشری کے مطابق ہے۔

(۲) کتب خانہ پیرس کی ایک پرانی کتاب کے قلمی نسخہ میں لکھا ہے کہ آنحضرت کی ولادت سے پہلے جو مشتری اور زحل کا قران ہوا تھا اس سال کے اعتدال ربیعی اور آنحضرت کے سال ہجرت کے پہلے دن کے درمیان ۵۱ سال چار مہینہ اور سولہ گھنٹے (فارسی سال کے حساب سے) کا فرق تھا۔

حساب کی رو سے ثابت ہے کہ ولادت باسعادت سے پہلے ۲۹ یا ۳۰ مارچ کو قرانِ مذکور واقع ہوا تھا اور آفتاب نقطۂ اعتدال پر ۱۹ مارچ ۵۷۱ء کو رات کے ۳ بجکر ۱۱ منٹ پر ہوا تھا لہذا سالِ ہجرت کے

محرم کی پہلی تاریخ، ۱۹- مارچ ۵۷۱ء کو ۳ بجکر ۱۱ منٹ پر شروع ہوئی ہوگی اور ان دونوں کے درمیان (فارسی سنہ کے حساب سے) ۵۱ سال چار مہینے آٹھ دن اور سولہ گھنٹے کا فرق ہونا چاہیے اور چونکہ فارسی سال ۳۶۵ دن کا ہوتا ہے، اس لئے اِس مدت کے اگر ہم دن بنائیں گے تو ۱۸۷۴۳ دن ۱۶ گھنٹے ہوں گے اور چونکہ ہجرت، محرم سے ایک مہینہ آٹھ روز بعد ہوئی ہے اس لئے درمیان ہجرت اور درمیان اعتدال ربیعی کے (۱۸۷۴۴ + ۶۷ = ۱۸۸۱۱) دن گذرے ہوں گے اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اعتدالِ ربیعی ۱۹ مارچ ۵۷۱ء کو واقع ہوا تھا اِس لئے اس حساب سے بھی تاریخ ہجرت ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء نکلتی ہے اور یہی ۱۰ تشری کے مطابق ہے جو یہودیوں کے صوم الکبور کا دن ہے۔

نوائے راز

جلوہ بے پردہ دکھا انجمن آرا ہو کر — مدعی سجدہ کرے محوِ تماشا ہو کر
قعرِ دل گوہرِ مقصود کا گنجینہ ہے — مفت سر پھوڑ نہ موج لبِ دریا ہو کر
آج تک مایلِ رم ہے، ترے دیوانہ کی روح — نکہتِ باغ کبھی آہوئے صحرا ہو کر
الحفیظ، آج دگرگوں ہے نظامِ عالم — کس نے الٹی ہے نقاب انجمن آرا ہو کر
عبرت آموز ہے نیرنگیِ قدرت تیری — تنگیِ گور کبھی، وسعتِ صحرا ہو کر
ہر بگولا نظر آتا ہے مجھے محملِ یار — رہ گیا قیس، تو گردِ رہِ لیلیٰ ہو کر

کاٹ تلوار کا ہے میری زباں میں نشتر
کیوں نہ کھٹکوں نگہِ غیر میں کانٹا ہو کر

نشتر

میرؔ کا دل

حسن و محبت حیات شعری کے وہ عناصر ہیں کہ اگر آج ان دونوں کا امتزاج صفحۂ ہستی سے معدوم کر دیا جائے تو نہ صرف دُنیائے شاعری ویران ہو جائے، بلکہ عالمِ اخلاق بھی غیر آباد محسوس ہونے لگے۔

اگر نگاہ کو ذرا وسیع کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سارا نظام عالم تمام دُنیائے تکوین، جملہ نوامیس فطرت اور کائنات کا ہر کم و کیف قدرت کے جملہ مظاہر و آثار، سب حُسن و محبت کے تعلق باہمی کے نتائج ہیں، اگر حُسن کو کھربائیت مطلق یا جذب محض اور محبت کو انجذاب، تاثر کشش یا قبول جذب تصور کر لیا جائے۔

امواج بحر کا مد و جزر، اجرام فلک کی گردش، زمین کا رقص، موسموں کا تغیر یہاں تک کہ خود انسان کا وجود (اگر نگاہ غامض سے کام لیا جائے) اسی جذب و انجذاب کا نتیجہ ہے، آہن و مقناطیس، گُل و بلبل، شمع و پروانہ خورد شبنم، ذرہ و مہر کا ذکر ہی کیا۔

اگر آج یہ علاقۂ فطرت، یہ رابطۂ قدرت یہ کھینچنے اور کھنچ جانے کا واسطہ محو ہو جائے تو ماں اپنے بیٹے کو بھول جائے، بیوی اپنے شوہر سے محبت کرنا ترک کر دے، اور مہر و وفا، صدق و خلوص، لطف و رافت اور ہر وہ جذبہ جس سے نظام تمدن قائم ہے یکسر موقوف ہو کر سارا کرۂ ارض غیر آباد نظر آنے لگے۔ الغرض یہ حقیقت نہایت عام ہے اور اس قدر عام کہ ہم کبھی اس کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے۔

جب ایک عالم طبیعیات، اک ہئیت داں، اس سے بحث کرتا ہے تو وہ اس کے لئے اصطلاحات وضع کرتا ہے، خالص علمی (اس لئے ذرا غیر دلچسپ) طریق استدلال اختیار کرتا ہے، جس سے ہم گھبراتے ہیں لیکن ایک شاعر جب اس موضوع پر گفتگو کرتا ہے (اور اس کا موضوع ہمیشہ یہی ہوتا ہے) تو وہ ہمارے سامنے ایسی مثالیں پیش کرتا ہے، ایسا انداز بیان اختیار کرتا ہے اور اس کے نتیجہ کو کسی ایسے واقعہ پر منطبق کرتا ہے کہ ہم فوراً اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ایک خاص کیفیت اپنے اندر محسوس کرنے لگتے ہیں۔

جب آفتاب طلوع کرتا ہے تو شبنم غائب ہو جاتی ہے ایک سائنس داں اس کی وجہ بیان کرے گا

کہ حرارتِ آفتاب شبنم میں تبخر پیدا کر دیتی ہے اور اس کے اجزار مائی بخارات کی صورت میں صعود کر جاتے ہیں اور اسی جگہ یہ مسئلہ ختم ہو جائے گا، لیکن ایک شاعر جب اس کو بیان کرے گا تو ہر چند وہ اس حقیقت سے بحث نہ کرے گا، کہ شبنم کیونکر غائب ہو گئی لیکن اس سلسلہ میں وہ ایک نہایت دلچسپ نتیجہ پیش کر کے یوں کہے گا۔

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم	میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

دوسرے مصرعہ نے اس مضمون کو سائنس کے حدود سے الگ کر کے شاعری کے لئے مخصوص کر دیا۔

قانونِ تجاذب، کششِ مرکزی اک مسلم مسئلہ ہے اور دنیا کا کوئی ذرہ آزاد نہیں ہے، ایک شاعر بھی اس کو تسلیم کرتا ہے لیکن اسے اس انداز سے بیان کرتا ہے۔

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو	وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

الغرض سائنس و فلسفہ کے تمام حقائق ثابتہ شاعر کے پیش نظر ہوتے ہیں لیکن اس کا اندازِ بیان صرف ہماری روحانیت کو متاثر کرتا ہے اور اُس دنیا سے متعلق ہوتا ہے جسے ہم عالمِ اخلاق کہتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ اس خیال کو پیش نظر رکھ کر اگر حقیقی شاعر کی تلاش کیجئے گا تو آپ کو بہت کم ملیں گے لیکن اس کے بعد ایک اور درجہ ہے جو نظریاتِ حکمت سے زیادہ دُور کا تعلق رکھتا ہے اور جس میں صرف وارداتِ دل اور کیفیاتِ محبت سے بحث کی جاتی ہے۔ اس کو بہت لوگوں نے اختیار کیا، لیکن جس قدر تکمیل کے ساتھ میر نے اس کے تمام مدارج سے بحث کی ہے اور جس جس اسلوب سے دل کی تاثرات و کیفیات کا ذکر کیا ہے اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ جس طرح فلسفیانہ شاعری غالب کے لئے ہو گئی ہے۔

اسی بنا پر میرا خیال عرصہ سے تھا کہ صرف دل کے متعلق جس قدر خیالات میر نے ظاہر کئے ہیں ان کو یکجا کر دیا جائے تا کہ اس طرح شروع سے لے کر آخر تک تمام مدارجِ محبت کی کیفیات بیان ہو جائیں اور یوں بھی نوعیتِ انتخاب کے لحاظ سے اک نئی چیز ہو۔

میر کی جذبات نگاری اک ایسی مسلمہ حقیقت ہے کہ اس سے بحث کرنا افسانہ کہن کا اعادہ کرنا ہے دنیا نے تسلیم کر لیا ہے کہ وارداتِ محبت بیان کرنے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتا اور عشق کی کیفیات کو اُس سے زیادہ کسی نے نہیں سمجھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے اُس کے بہترین اشعار وہی ہیں جس میں دل یا متعلقات

دل سے بحث کی گئی ہے اور اب ہم ذیل میں میرؔ کے انہیں اشعار کا انتخاب پیش کرتے ہیں، جن میں دل کا ذکر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ مدارج محبت کے لحاظ سے کہیں انتخاب میں تقدیم و تاخیر آپ کو نظر آجائے سو اس کو میں ناظرین نگار کے ذوق سلیم پر چھوڑتا ہوں کہ وہ اس ترتیب کو خود قایم کرلیں۔

محبت کا مفہوم

محبت کی تعریف میں شیفتہ کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

شائد اسی کا نام محبت ہے شیفتہ — اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

اسی طرح حالی کا یہ مصرع ۔ خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا۔ نہایت مقبول ہوا۔

میر نے بھی قریب قریب اسی مفہوم کو مختلف صورتوں سے بیان کیا ہے۔

محبت نے شائد کہ دی دل کو آگ — دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف

دیکھ لو دل کہ جان سے اٹھتا ہے — یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

کیا جانیئے کہ چھاتی جلی ہے کہ دل کا داغ — اک آگ سی لگی ہے کہیں کچھ دھواں سا ہے

لیکن ایک جگہ اس سے زیادہ موثر و دلنشین طریقہ پر ابتدائی محبت کی کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن — سینہ میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

محبت کی دوسری منزل وہ ہے جب ضبط باقی نہیں رہتا اور راز دل بے اختیار ظاہر ہو جاتا ہے، اس کو میر صاحب نے یوں بیان کیا ہے۔

نام اس کا سن کے آنسو گر ہی پڑے پلک سے — دل کا لگاؤ یارو چھپتا نہیں چھپایا

پوشیدہ راز عشق چلا جائے تھا سو آج — بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا

کیا تنک حوصلہ تھے دیدہ و دل اپنے آہ — ایک دم راز محبت کا چھپایا نہ گیا

کب اس کا نام لئے غش نہ آگیا مجھ کو — دل ستم زدہ کس وقت اس میں جا نہ رہا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

دل کی ویرانی

میرؔ کے بہترین اشعار وہی ہیں، جن میں صراحتہً یا کنایتہً دل کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا ہے بعض جگہ وہ اس طرح بیان کرتے ہیں گویا دل کی ویرانی و آبادی کا تجربہ انہوں نے بارہا کیا ہے اور آخر کار انجام اس کا بربادی پر ہوا، جو لازمی نتیجہ الفت و محبت کا ہے مثلاً:-

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے — یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
شہرِ دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں — آخر اُجاڑ دینا اس کا قرار پایا

دوسرے شعر میں یاس و امید کی کیفیت ظاہر کر کے اس نتیجہ کو پیش کیا ہے، جو ایک عاشق کا مقسوم ہے۔ "قرار پایا" سے میر نے اس شعر کے مفہوم میں جس قدر وسعت پیدا کر دی ہے، اس کو صرف ذوقِ سلیم سمجھ سکتا ہے۔

میر نے اکثر جگہ نہایت صراحت کے ساتھ اس عنوان کو اپنا موضوع شعری قرار دیا ہے اور ہر جگہ انداز بیاں یا طرز ادا سے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اب انہیں اس کی آبادی کی طرف سے کلی یاس ہو گئی ہے اور حقیقی معنے میں شاعر کی زندگی حد درجہ وحشت خیز ہو گئی ہے مثلاً :-

اس شہرِ دل کو تو بھی جو دیکھے تو کہہ اُٹھے — کیا جانیے کہ بستی یہ کب کی خراب ہے
خرابی دل کی کیا اب وہ درد و غم سے پوچھو ہو — وہی حالت ہے جیسے شہر لشکر لوٹ جاتا ہے
دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ — جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا
خرابی دلکی اس حد تک ہے کہ اب سمجھا نہیں جاتا — کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا
منزل اس مہ کی رہا جو مدتوں اے ہمنشیں — اب وہ دل گویا کہ اک مدت کا ماتم خانہ تھا
دلکی آبادی کو پہونچا اپنی، گویا چشم زخم — دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر سب ویراں ہوا
دلکی معموری کی مت کر فکر فرصت چاہیئے — ایسے ویرانہ کے اب بسنے کو مدت چاہیئے
وہ دل کہ تیرے ہوتے رہے تھا بھرا بھرا — اب اس کو دیکھیئے تو ہے اک گھر خراب سا
شہرِ دل آہ، عجب جائے تھی، پر اسکے گئے — ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بسا یا نہ گیا

بعض جگہ وہ اسی سلسلہ میں کہیں کہیں پھر اس کی آبادی کی بھی تمنا ظاہر کر دیتے ہیں، جیسے :-

تم دل سے جو گئے تو خرابی بہت رہی — پھر بھی بساؤ آکے اس اُجڑے نگر کے تئیں
دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے — پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اُجاڑ کر

بیتابی و فراوانی جذبات | میر کے کلام میں کثرت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو اس عنوان کے تحت میں جگہ پا سکتے ہیں، لیکن وہ اشعار جن میں صراحۃً دل کا ذکر ہے کم ہیں۔ تاہم جتنے بھی ہیں قیامت ہیں۔ بعض جگہ میر صاحب صراحۃً اپنی بیتابی کا اظہار کرتے ہیں مثلاً :-

کیونکر نہ مرر ہے جو بیتاب تیر سا ہو
اک آدھ دن تو گھر سے دل تھام تھام نکلا

شعر مذکور میں نہایت لطیف صورت سے یہ ظاہر کیا ہے کہ آخر کار بیتابی جان لے کر ٹلی۔ دوسری جگہ قریب قریب اسی خیال کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں :-

غالب کہ یہ دل خستہ شب ہجر میں مر جائے
یہ رات نہیں وہ کہ کہانی میں گزر جائے

اسی سلسلہ میں جب وہ اپنے التہاب محبت اور سوزشِ عشق کا بیان کرتے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ الفاظ سے چنگاریاں اڑنے لگتی ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر نے اپنا تڑپتا ہوا دل نکالکر کاغذ پر رکھ دیا ہے، مثلاً :-

دل بہم پہونچا بدن میں تب سے سارا تن جلا
آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا

بے طاقتی میں تو، تو اے میر جر رہے گا
ایسی تپش سے دل کے کوئی جگر رہے گا ؟

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہیگا دل
تو صبح تک تو ہات لگا یا نہ جائے گا ،

اسی قبیل کا ایک اور شعر ہے جس میں کرب و درد کو حد درجہ موثر طریقہ سے ظاہر کیا ہے :-

صدا ہے آہ، جیسے تیر دل کے پار ہوتی ہے
کسو بے درد نے کھینچا کسو کے دل سے پیکاں کو

لیکن فراوانی جذبات، وسعت معانی اور بلاغت کے لحاظ سے یہ شعر اس سلسلہ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا :-

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

دیگر خصوصیات دل چونکہ اڈیٹر صاحب نگار نے چھ صفحات سے زیادہ مجھے اس موضوع پر لکھنے کی اجازت نہیں دی ہے، اس لئے میں تحتی عنوانات جدا جدا قایم نہیں کرتا اور "دیگر خصوصیات" کے تحت میں، دل کی اُن مختلف حالتوں کو جنہیں میر نے ظاہر کیا ہے مختصراً بیان کئے دیتا ہوں۔

نصیحت کے پیرایہ میں میر نے بعض جذبات نہایت موثر طریقہ پر ظاہر کئے ہیں۔ ابتدائے محبت کا ایک منظر ملاحظہ کیجئے :-

پاداش کی اپنی خوب نہیں میر، باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

اس کے بعد وہ اسی انداز میں انجام محبت کو پیش کرتے ہیں :-

میں منع میر تجھ کو کرتا نہ تھا ہمیشہ
کھوئی نہ جان تو نے دل کو لگا لگا کر

لگا نہ دل کو کہیں، کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

مجبوری محبت کا اظہار میر نے اکثر جگہ کیا ہے لیکن انداز قریب قریب ایک سا ہے :-

دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور — اس میں کیا اختیار ہے اپنا
بے طاقتی کریں تو تم بھی معاف رکھیو — کیا کیجئے کہ دل ہی مجبور ہے ہمارا

انجام الفت، جو تمام شعراء کے ہاں ایک ہی ہوا کرتا ہے، میر کے ہاں بھی وہی ہے، لیکن انداز بیاں کی دلدوزی سے میر نے اسے بھی اپنے مخصوص رنگ میں داخل کر لیا ہے :-

فرصت میں یک نفس کے کیا حالِ دل سنو گے — آئے تو تم ولیکن وقتِ اخیر آئے
اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا، اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
اس جینے سے اب دل کو اُٹھا لیویں گے ہم بھی — ہے تجھکو قسم ظلم سے مت ہاتھ اُٹھا تو
وصل و ہجراں یہ جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی — دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

اس سلسلہ میں بعض جگہ میر نے ایسے جذبات عالیہ کا اظہار کیا ہے کہ اس میں اب اضافہ کرنا بالکل محال ہے مثلاً

شکر اس کی جفا کا ہو نہ سکا — دل سے اپنے ہمیں گلہ ہے یہ

قریب قریب اسی مضمون کا ایک اور شعر میر نے لکھا ہے، جو اس لئے انتخاب میں نہیں آیا کہ اس میں لفظ دل کا ذکر نہیں ہے، لکھتے ہیں :-

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے — عمر نے ہم سے بے وفائی کی

لیکن ان سے بھی زیادہ تکمیل کے ساتھ میر نے اک ایسا شعر اس مضمون پر لکھدیا ہے کہ اس کا جواب قطعاً ناممکن ہے۔ ملاحظہ ہو :-

اب حال دل ہے اُن کے دلخواہ — کیا پوچھتے ہو الحمد للہ

اس کے بعد میں مختلف اشعار جن میں دل کا ذکر ہے یہاں درج کرتا ہوں :-

دانستہ ہے تغافل، غم کہنا اس سے حاصل — تم دردِ دل کہو گے وہ سر جھکا کرے گا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
دل دینے کی ایسی حرکت ان نے نہیں کی — جب تک جیئے گا میر پشیماں رہے گا
میں روؤں، تم ہنسو ہو، کیا جانو میر صاحب — دل آپ کا کسو سے شاید لگا نہیں ہے

نے خون ہو آنکھوں سے بہا، ٹک نہ ہوا داغ
اپنا تو یہ دل میرؔ کسو کام نہ آیا

کوئی دادِ دل آہ، کس سے کرے
ہر اک ہے سو اس فتنہ گر کی طرف

آخری شعر کے مضمون کو مومن کے ایک شاگرد بیمار نے بیان کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا جواب ہو نہیں سکتا لکھتا ہے۔

کون پرساں ہے حالِ بسمل کا
خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

اِس انتخاب کو اس نظر سے نہ دیکھنا چاہیئے کہ کلام میرؔ کے ہر رنگ کا نمونہ اس میں نظر آئے گا، بلکہ صرف اس خصوصیت کو سامنے رکھکر دیکھنا چاہیئے کہ جن اشعار میں لفظ دل کا صراحۃً ذکر کیا گیا ہے، اُن میں سے بہترین اشعار یہ تھے جو اِس جگہ درج کئے گئے۔ اِس میں شک نہیں کہ بہت سے ایسے اشعار بھی ترک کر دئے گئے ہیں جن میں دل کا ذکر ہے، لیکن ان کا ترک کرنا صرف اِس بنا پر ہے کہ اُن میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی جو اُن کے انتخاب کو ضروری قرار دیتی۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ چند صفحات میں اس سے زیادہ گنجایش کہاں تھی کہ میں زیادہ نرمی کے ساتھ انتخاب کرتا اور دوسرے درجہ کے اشعار بھی درج کر دیتا۔

قمر

کلام فانی

فانیؔ، کفِ قاتل میں شمشیر نظر آئی
لے خوابِ محبت کی تعبیر نظر آئی

پھر ابر میں وحشت کی تصویر نظر آئی
لہرائی ہوئی بجلی زنجیر نظر آئی

جب میں نے دعاؤں کا رُخ سوئے فلک دیکھا
تدبیر کے پہلو میں تقدیر نظر آئی

ہر عیش کی محفل میں پروانہ کا ماتم تھا
جو شمع نظر آئی دلگیر نظر آئی

کعبہ میں کلیسہ میں ہم نے تو جہاں دیکھا
اے قصرِ وفا تیری تعمیر نظر آئی

جب خون ہوا دل کا وہ آنکھوں میں آ بیٹھے
آہوں کا حجاب اُٹھا، تاثیر نظر آئی

کایا غمِ دنیا کی وحشت نے پلٹ دی ہی
خاکِ رہِ ویرانہ اکسیر نظر آئی

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

دل اُن کے نہ آنے تک لبریز شکایت تھا
وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی

فانیؔ غمِ ہستی نے زندہ ہی مجھے سمجھا
جب تک مرے مرنے میں تاخیر نظر آئی

مشہد عروس

(۴)

بہ سلسلہ ماسبق

بہ استثنائے معدودے چند، موجودہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کی یہی آرزوئیں ہیں جن کے حصول کے لئے ان کے مغرب پرست دل ہر وقت مضطرب رہتے ہیں۔ لیکن جو لوگ تصنع اور واقعیت میں تمیز رکھتے ہیں، جو لوگ طمع اور اصل میں امتیاز کر لیتے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ گلگوں غازہ، خون نہیں تھکواتا بلکہ وہ کسی کی نگہ شرم آگیں ہے جو خاموشی سے ذبح کر دیتی ہے۔ رفتار کا تصنع خرام ناز نہیں کہلاتا، بلکہ اس کا تعلق فطری بیباختگی سے ہے، بے نقاب چہرے کی تابش اضطراب نہیں پیدا کرتی، بلکہ کسی کا روئے سیمیں کو آنچل سے چھپا لینا بیقرار بنا جاتا ہے۔

بنی نوع انسان نے حدود خداوندی سے جب کبھی بھی تجاوز کیا ہے، اس پر اخلاقی اور تمدنی تباہیاں آئی ہیں اور یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ تخلیق نسائیت کے منشاء کو جنس قوی نے ہمیشہ ٹھکرایا ہے، لیکن اس عالم اضطراب و گمراہی پر اس کے بعد ہی سے آنے والے زمانہ نے لعنتیں بھی برسائی ہیں۔

عورت، جس کو خدا نے نسل انسانی کی افزائش، بزم دنیا کی زیبائش، ازدیاد لطف و فراغت کے لئے، وجہ محبت و رحمت بنا کر پیدا کیا تھا، افسوس کہ اقوام عالم میں اس کی کچھ عجیب طور پر قدر و منزلت ہوئی اور انوکھے طریقہ سے اس کے ساتھ سلوک کیا گیا۔

اس جنس پر ایک وہ دور بھی گذر گیا ہے، جب وہ صرف ایک جام سفالین کا معاوضہ سمجھی جاتی تھی، نہ اس کی کوئی قیمت تھی اور نہ اس کے ادائے لطف و احسان کی کوئی قدر۔ وہ زنگ آلود، بربط تھی، اک نغمہ تھی سماعت سے دور، اور اک لحن تھی اثر سے خالی۔ یونان کی علمی ترقیوں سے ارسطو کے کمال حکمت و فلسفہ سے، سلطنت رومۃ الکبریٰ کی قانون سازی کی قابلیت سے اور زمانہ قدیم کے ہندو عالموں کے اکتشافات علمیہ سے، دنیا انکار نہیں کرتی، لیکن ہاں اس بات سے انکار ہے کہ انہوں نے اپنے اس دور تہذیب و ترقی میں عورت کی بھی کوئی قدر و عظمت کی ہو۔

تاریخ موجود ہے اُٹھاکر دیکھ لو، عورت محض غلامانہ پرستاری کے لئے مرد کی دست نگر اور تابعداری کے واسطے رسوا رہی اور ذلیل سے ذلیل رجحانات طبع کی قربانی کے لئے وقف کردی گئی، فرانس کے کسی لائق پروفیسر نے دُنیا کی تہذیب پر اک کتاب لکھی ہے، اس کا جو حصہ عورتوں سے متعلق ہے اس میں لکھا ہے کہ "یونانیوں اور رومیوں کے زمانہ میں عورت کی یہ حالت تھی کہ وہ مردوں کی منقولہ اشیاء میں ایک بجیس شے تھی" افلاطون کا قول ہے کہ "شادی بیاہ اک مجبوری کا نام ہے، یہ کوئی مسرت کا مقام نہیں" روم میں عورتیں مثل جائداد کے منتقل ہوسکتی تھیں ۱۸۵۰ء سے قبل خود انگلستان میں، عورت کے اندر روح کا ہونا مشتبہ سمجھا جاتا تھا۔ یہودیوں میں عورت ایک زرِ خرید شے سے زیادہ عظمت نہ رکھتی تھی، اہلِ چین اس کو اپنا قیدی جانتے تھے۔

قوی الاعضا عورتیں مسلح کرکے میدانِ جنگ میں بھیجی جاتی تھیں۔ اور ادنیٰ غلطی کے ارتکاب پر وہ ہلاک کردی جاتی تھیں۔ عرب میں دخترکشی کا عام رواج تھا اور ہندوستان میں عورتوں کو جوئے میں ہار دینا ایک معمولی بات تھی۔

غرض تضحیک و تمسخر کا وہ کوئی پہلو نہ تھا جو خدا کی اس محترم ترین مخلوق کے ساتھ دُنیا والوں نے روا نہ رکھا ہو، مگر کب تک۔ آخرکار بانیِ اسلام پیدا ہوا اور اس نے سوسائٹی کے تمام مذموم قوانین کو بدلکر عورت کے اس دُکھ کو بھی دُور کیا اور اس کے لئے ایسے اصول مرتب کئے جو افراط و تفریط سے الگ بہترین نعمت خیال کئے جاتے ہیں اور جن کے مقابلہ میں اس وقت دُنیا کی کوئی مہذب قوم دعوائے ہمسری نہیں کرسکتی۔

اسلام نے اس مبارک اشتراک جنسی کے متعلق جس قدر ہدایات و تبصیرتیں عطا کی ہیں وہ تمام معاشری و تمدنی نزاکتوں کو محیط اور بہترین خصوصیات اور مصالح سے مملو ہیں، اُن لوگوں کو جو شادی کا نام اک مجبوری رکھتے ہیں، اور عورت کے احترام جنسی کے قائل نہیں متنبہ کیا جاتا ہے کہ تم اس نکہت و لطافت سے تسکین و تسلی حاصل کرو اور یہ محسوس کرو کہ ہم نے تم میں ایک مودت و رحمت ودیعت کی ہے تاکہ آپس میں تم ایک دوسرے سے محبت کرو اور ہمدردی کے برتاؤ۔

عورت چونکہ فطرتاً نازک وضع ہوئی، وہ معذور ہے کہ شدائد کی متحمل ہوسکے، چنانچہ اس کی نزاکت فطرت کو کیسے پیارے انداز سے ادا کیا جاتا ہے۔ ساربان زنانہ سواریوں کا اونٹ لئے جارہا ہے، حضور اکرم صلعم فرماتے

ہیں آہستہ آہستہ، یہ شیشے ہیں ان کو ٹھیس نہ لگ جائے"۔

عظمت و محبت کے تعلقات کا پتہ جذبات سے لگتا ہے آپ ہمارے رسول اکرم کے ارشادات کو سمجھئے اور پھر غور کیجئے کہ اولیائے جمہور اور مصلحین امم کی ہر بات کس طرح عوام کے لئے سبیلِ راہ ہوتی ہے اور وہ اپنے افعال و اقوال کو کیونکر جمہور کے واسطے نمونہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

اِن لوگوں کے لئے جو عورت کو اک منقولہ شے اور قابل انتقال سمجھتے تھے اور وہ جن کے نزدیک اُن میں روح کا پایا جانا بھی مشتبہ تھا اور اِس کو قیدی اور جاکر جانتے تھے اور وہ جن کے لئے اس کی نسبت باعث شرم و غیرت تھی اُن کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ بالکل تمہارے برابر ہے اور تمہارے ساتھ بالکل مساویانہ درجہ رکھتی ہے اور تم کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ اِس کو اس طرح تم ذلیل کرو اور اپنے سے ایک ادنیٰ جنس تصور کرو، ہاں پھر اُن خود غرض انسانوں کو فہمائش کی جاتی ہے جو اِس جنس لطیف کو میلے کپڑوں کی طرح بلا تکلف، ہر وقت الگ کر دیتے تھے اُن سے کہا جاتا ہے، نادانو عظمت کرو، یہ تمہارے لئے عظمت کی چیز بنا کر دُنیا میں بھیجی گئی ہے یہ تم سے اور تم اِس سے کسی حال میں جدا نہیں رہ سکتے، تمہارا اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے، تم اِس کے پردہ دار اور وہ تمہاری پردہ پوش ہے، هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔

عورت کو قدرت نے جن فرائض کی انجام دہی کے لئے پیدا کیا ہے ان کو وہ کبھی بھی اور کسی حالت میں بھی نہیں بھول سکتی، اس کی حقیقت آج بھی ویسی ہی مسلم ہے، جیسی کہ ابتدائے عہد وحشت میں رہی ہو گی، وہ انسان کا سکون خاطر ہے وہ انسانیت کی جامع ہے، وہ انسان کی ماں بننے کے لئے پیدا کی گئی ہے اس کی نازک اور جمیل، لیکن انفعال آمیز خلقت کبھی بھی اُن کاموں کے لئے موزوں نہیں ہے جو گھر کی چار دیواری سے باہر انجام دئے جاتے ہیں۔ موجودہ تہذیب مغرب اور مدنیت کبریٰ نے اس قدر حد بندی کو توڑ دیا ہے اور عورت کو اس کی گھر کی شہنشاہی سے نکال کر غذا حاصل کرنے کی مصیبتوں اور زمانہ کی پُر زحمت آوارہ گردیوں میں مبتلا کر دیا ہے، تاہم نتیجہ اس کا وہی نکلا، جو احکام قدرت کی ہر خلاف ورزی عمل کا ہونا چاہیئے، ایسے لوگوں پر اخلاق و معاشرت کی وہی رسوائیاں آئیں، جو اس سے قبل ہر حد و شکن قوم پر نازل ہوتی رہی ہیں، آج یورپ و امریکہ میں عورتیں بقول اڈیٹر سائنس پروگرس، ایک محنتی محرر، اک دفتری کلرک یا کسی ورزشی کھیل کے میدان میں اول درجے کا چاندی کا کپ پانے والی ضرور ہیں،

مگر نہ تو وہ ایک اچھی ماں ہے جو بچوں کی پرورش کر سکتی ہے اور نہ اپنے نسوانی فرائض ادا کرنے والی بیوی ہے، جس کے کاموں کا میدان گھر کے اندر بنایا گیا ہے۔

موجودہ عہد کا ایک بہت بڑا سوشیالسٹ، مسٹر بریڈن اب سے بہت عرصہ پہلے ایسی عورتوں پر ماتم کرتا ہوا لکھتا ہے کہ "خلقتِ انسانی کا وہ جمیل و لطیف نصف حصہ، جس کا شگفتہ چہرہ کائنات کا اصلی حسن، اور جس کی مسکراہٹ عالم ارضی کی حقیقی مسرت تھی، افسوس ہے کہ دنیا سے چھینا جا رہا ہے اور گویا ارادہ کر لیا گیا ہے کہ اب دنیا میں مرد بغیر عورت کے رہیں گے اور فطرت نے مرد اور عورت کو دو جنس قرار دینے اور اس تفریق کی ضرورت کے سمجھنے میں جو ایک سخت غلطی کی تھی وہ بلا اصلاح پائے ہرگز نہ چھوڑی جائے گی"

وہ وقت بہت قریب ہے کہ جب "عورت" کا وجود صرف گذشتہ زمانہ کے شعراء کے تخیلات اور عہد قدیم کے صحائف و اوراق سے باہر نہ ملے گا، لوگ آہ سرد بھر کر کہیں گے کہ ملٹن نے اپنی نظم میں عورت کے محسوسات بتلائے ہیں یا ڈکنس نے اپنی کہانی میں ایک دوشیزہ لڑکی کی تصویر کھینچی ہے، وہ بڑی ہی خوبصورت اور دلربا چیز ہے۔

مگر افسوس کہ اب زمین پر عورتوں کا پیدا ہونا موقوف ہو گیا یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں محض شاعرانہ تخیل نہیں ہے یہ واقعات و حقائق ہیں جن پر متمدن دنیا کا ہر باشندہ میری ہی طرح رو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ دنیا کو دیکھنے میں میرے برابر آ کھڑا ہو۔ اس آنے والے زمانہ کو چھوڑ دو، جس میں ہمارے موجودہ تمدن کی غلط کاریاں اور بھی ضلالت پیدا کریں گی، تم موجودہ عہد ہی میں تلاش کرو کہ متمدن دنیا کے بڑے بڑے دارالحکومتوں میں عورتیں کتنی ہیں اور کہاں بستی ہیں کیا تم اس جدید مخلوق کو بھی عورت کہنے کی جرأت کرتے ہو جو لندن اور نیویارک کے کارخانوں میں چکری کی طرح حرکت کر رہی ہیں۔"

میں سچ کہتا ہوں وہ نہ تو ماں ہے اور نہ بیوی ہے، اس کا سر نہ تو کسی قدرتی رفیق کے سینہ پر ہے اور نہ اس کی گود میں محبت و اتحاد کی کوئی روح۔ ہاں وہ محنت و مشقت کی ایک افسردہ زیست ہے یا پھر کارخانوں کی ایک مضطرب الحال مزدور اور نہیں تو وہ ایک ایسی مخلوق ہے جو مثل مردوں کے روٹی اور کپڑا حاصل کرنے کے لئے محنت سرائے عالم کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں کود پڑی ہے، البتہ مرد محنت و مشقت اگر کرتا ہے تو اپنی بیوی اور اس کے بچوں کے لئے اور حیف، کہ یہ صرف اپنے نفس کے لئے کر رہی ہے۔

بہرحال وہ کوئی ہو۔ لیکن قطعاً عورت تو ہے نہیں۔ مرد بھی نہیں ہو سکتی، پس وہ ایک تیسری جنس ہے، جس کو خدا کے بجائے خود شریر اور گستاخ انسان نے پیدا کیا ہے۔"

عورت اور مرد کے فرائض بالکل الگ الگ تھے، ان کی نسبت جو کچھ ابتدا سے ہو رہا تھا، وہی خدا کا قانون تھا، لیکن افسوس اس کو توڑ ڈالا گیا۔ عورت، نوعِ انسان کی تکثیر اور اس کی پرورش و تربیت کے لئے تھی، کارخانوں میں مزدوری تلاش کرنے کے واسطے نہ تھی، نہ اس لئے تھی کہ مدت العمر مجرد رہ کر سوسائٹی کا ایک کم قیمت کھلونا بنی رہی، اور نہ پھر اس لئے تھی کہ وہ ہر بزم کی زینت بنے، یا سڑکوں اور تفرج گاہوں کے اندر ایک آلۂ رونق کی طرح متحرک رہے۔

جبکہ یہ حدود توڑ دئے گئے اور عورت پر وہ فرائض ڈال دئے گئے جو صرف مردوں کے لئے مخصوص تھے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ عورت اپنے جسم سے وہ کام لینے لگی جو اس کا اصلی کام نہ تھا۔

اس حالت نے اس کے محسوسات بدل ڈالے، اس کے جذبات میں تغیر عظیم پیدا ہو گیا اس کا نازک جسم محنتوں اور مشقتوں سے گھلا گیا، بلکہ اس کے اندر ایک عضوی انقلاب کے آثار نمایاں ہونے لگے، اب نہ اس کا عورت کا سا چہرہ ہے اور نہ عورت کا سا دل۔ وہ اپنے تمام جذبات لطیفہ و رقیقہ سے محروم ہو گئی ہے، وہ مرد بھی نہ بنی جس کے بننے کے شوق میں اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ اور آہ، وہ عورت بھی نہ رہی جس کے لئے اس کو کچھ بھی تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

اب یقیناً اس کو تیسری جنس ہی کہنا چاہئے جو خلقتِ انسانی کا نیا نمونہ ہے اور جس کا وجود سوسائٹی اور خاندان کے لئے لاکھوں بربادیوں کا پیام ہے۔

اس لئے عورتوں کو تعلیم دینے، پردے سے باہر نکالنے، اور گون پہنانے، باغوں اور پارکوں میں پھرانے، عام حقوق و مقاصد حیات میں برابر سمجھنے کے لئے تمہیں یورپ کی شاگردی و نقالی اور مغرب کی غلامانہ تقلید کی ضرورت نہیں، تمہارے پاس وہ سب کچھ موجود ہے جو سب سے بہتر اور اصلی ہے اور مضرتوں سے پاک ہے، اس پر عمل کرو اور یورپ سے تم اس چیز کی بھیک نہ مانگو جو خود اب اس کے لئے بھی وہ متاعِ عزت نہیں خیال کی جاتی، تم مغرب کے سامنے ایسی شے کے لئے ہاتھ نہ پھیلاؤ جس سے وہ خود بھی کچھ خوش نہیں۔

زکیہ:۔ شکر ہے آج کھل گئے، ہائے تو نے اتنی کی　　　جان گئی سمجھ گئی باعثِ نفرت دلی

خوش ہوں کہ آج حالِ دل تم نے مجھے سُنا دیا ؟ — طرزِ معاشرت تو خیر تم نے مجھے بتا دیا
مجھ میں کہاں یہ تاب ہے دونگی اُلٹ کے کچھ جواب — عرض کروں میں کچھ مگر ہو جو نہ باعث عتاب
فرض تھا آپ کا مجھے آکے سکھاتے طرزِ نو — کیسے بقول آپ کے بند قفس میں آتی ضو
جانتی ہوں نہیں بُرا غیر زبان جاننا — خوبیاں ہوں جو اور میں فرض ہے اُن کو ماننا
بالی بھی پھینک دونگی میں چوڑی بھی توڑ دونگی میں — منہدی نہ اب لگاؤنگی پان بھی چھوڑ دونگی میں
اس کے علاوہ کون بھی کرلونگی خیر میں قبول — پیانو بھی سیکھ لونگی میں ہوتے ہو تم اگر ملول

مجھے معلوم ہے نسائیت کی حقیقی عظمت، اسی میں پوشیدہ ہے کہ مرد کی نظر میں محبوب ہو، عورت کا سارا سنگھار اسی لئے ہے کہ وہ شوہر کا مرکزِ دلچسپی بنی رہے، بھلا مجھے اس میں کیوں عذر ہوتا، آپ اپنے جذبات سے مجبور ہیں اور میں خوش نہیں آتی، اچھا میں تعمیل کروں گی جو آپ کا ارشاد ہو گا، آپ اگر اُردو سے نفرت کرتے ہیں تو بہتر ہے میں انگریزی بھی سیکھوں گی، آپ بالی اور چوڑیوں سے کبیدہ خاطر ہیں تو یہ بھی آپ پر تصدق آپ منہدی اور پان سے چڑتے ہیں، لیجئے اس کو بھی چھوڑا اس مشرقی لباس سے آپ کو الجھن ہوتی ہے، اس کو بھی سلام کیا، سو نامکان بُرا معلوم ہوتا ہے تو اب پیانو کے نغمات دلکش سے آپ کے لئے سامان دلچسپی پیدا کرلوں گی۔ لیکن۔

مجھ سے نہ ہو گا یہ کبھی توڑ دوں پردۂ حیا — ایسی گھڑی جو آئے تو مجھکو نہ رکھیو اے خدا
غیر کی مجھ پہ ہو نگہ، کانپ گئی، لرز گئی — تم نے یہ کیا کہا غضب جس سے عرق عرق ہوئی
ہوتی مجھے فقط جو شرم ایک تمہارے نام کی — توڑ کے پھینک دیتی میں بیڑیاں روک تھام کی
سینکڑوں پشت سے مگر خونِ حیا رگوں میں ہے — ایک زمانہ ہو گیا آب وہی نگوں میں ہے
پہلے بدن کا خون تم فصد سے سب نچوڑ دو — پھر جو جیوں تو شوق سے پردہ کو میرے توڑ دو
یوں تو محال ہے مگر، غیر سے آنکھ چار ہو — چاہے عدو ہو وہ کوئی، چاہے تمہارا یار ہو

شوکت، خدا کے لئے ایسی حیا سوز باتوں پر کمر نہ باندھو، تم قوانین قدرت سے جنگ کی نہ ٹھراؤ، تم بیچرد فطرت کے خلاف اپنی سعی مہمل سے باز آجاؤ،

عورت وہ گہر آبدار، وہ ذرا سی بے احتیاطی میں ٹوٹنے، میلا اور بے آب ہو جانے والا موتی، عورت وہ غنچۂ سر بستہ، وہ معمۂ آب و رنگ، تھوڑی سی تمازت سے کمُھلا جانے والا پھول، خدارا تم اس کی تو ہین اس

طرح نہ کرو، پردہ نسائیت کی تزئین ہے، پردہ عورت کا حقیقی حسن ہے، للّٰہ تم اس میں دستبرد نہ کرو اور اس کو اس کے لیے بحال رکھو۔

نقل خصائص اجداد اور فلسفۂ تہذیب و تربیت، تیرے ہاں اگر کوئی چیز ہے تو تو زکیہ، حیا مآب زکیہ کو معذور جان وہ کیونکر اعدائے عصمت میں کھلے بندوں، جینے کے ارمان رکھے، وہ کیونکر غیروں کی ناپاک نظروں کا مقابلہ کرے، وہ کس طرح اپنے فطری انفعال اور حیا کو مبدل بہ آزادی و بیباکی کر دے۔

شوکت تم ہی انصاف کرو، خدارا تم ہی ایمان کی کہو کہ اس پردہ شکنی کے معاملہ میں اس بے حجاب و بے نقاب ہو جانے والے احکامات کی تعمیل میں وہ تمہارا کہا کرے یا قدرت اور قوانین فطرت کی لاج رکھے، پردہ کو تم کیا سمجھتے ہو پردہ کیا چیز ہے جانتے ہو۔

آہ یہ کائنات کے مالک اور فرمانروا کی سنت قدیم ہے، ساکنان فلک کی عفت ہے، یہ طور پر باتیں کرنے والے کا راز ہے یہ محمد کے گھرانے والوں کی آبرو ہے، یہ ازواج مطہرات کی تمثال عظمت ہے، یہ جناب فاطمہ زہرا رضؓ کا بند حجاب ہے، یہ جنگ جمل میں جنابہ عائشہؓ کا محافہ جمیل ہے، یہ حسینؑ ابن علی رضؓ کے خیموں کی ناموس ہے۔

شوکت! یہ خدا کا منشا ہے، رسول کا اسوہ پاک اور ارشاد فلاح ہے اور مسلمانوں کا طرۂ امتیاز، زکیہ کے گھرانے کی ناک ہے، اس کے خاندان کی روایات مشتہرہ اور اس کے ماں باپ کا شریف خون ہے، ہاں پردہ یہ پردہ، اس طرح آسانی سے نہ ٹوٹے گا، نہ چھوٹے گا، گذشتہ ایک دو پشت کے بزرگوں نے اس کے خاندان کو اگر ترتیب دیا ہوتا تو میں ضرور بے پردہ ہو جاتی، تم ہی بتاؤ میں کس کس کی غیرت کو فراموش کر دوں، اور کن کن کے ناموں کو ڈبو دوں، کس کس کی عزت کو پس پشت ڈال دوں اور کن کن کی ناموس کو بٹہ لگا لوں، بس یہی ایک طریقہ ہے کہ پہلے میرے تمام جسم کا خون کسی طرح نچوڑ لو اور جبکہ مجھ میں خدا کی شرم، مذہب کی حیا، قوم کی لاج، خون کی حرارت اور خاندان کی عزت کا پاس نہ رہے تو آسان ہے پھر جو کچھ چاہو میرا بناؤ، ورنہ یوں تو محال ہے غریب زکیہ اس طرح بیباک ہو سکے۔

پردے کی قید ہی اگر باعث ننگ و عار ہے
مرضی تمہاری چھوڑ دو کیا مجھے اختیار ہے

بندے کا اس میں زور کیا ہو جو نصیب ہی خراب
سینے میں ہو گی آگ جب، آپ ہی ہو گا دل کباب

روتی تھی جب بھی میں غریب رؤونگی اب بھی بدنصیب
تم سے نہ مل سکوں گی میں دور ہو مجھ سے یا قریب

مگر خبر

ہاں یہ مگر خبر نہ تھی یوں مجھے تم ستاؤ گے — سیر کرو گے دُور سے اور مجھے جلاؤ گے
خوش رہو تم جہاں رہو دیکھو نہ تم مری جبلن — مجھ کو ملیں خدا کرے دُور ہوں تم سے جو محن

عورت وہ جلد بدل جانے والی طبیعت کی ایک مضمحل ہستی ساری دنیا جانتی ہے کہ کس قدر زود رنج ہے اس کا تلون دُنیا کا اک مشہور راز ہے لیکن باوجود اپنی اس تذبذب و تزلزل کے وہ معتقداتِ مذہب کے لئے بے انتہا راسخ الخیال اور خوش عقیدہ ہوتی ہے، مذہب کے لئے اس کی والہانہ پرستاری قابلِ دید منظر ہوتا ہے، مذہب کے لئے وہ ہر طرح کی قربانیوں کو فوراً قبول کر لیتی ہے اور جذبات کی یہ کیفیت کسی ایک مذہب کے لئے مختص نہیں، بلکہ اس طبقہ میں مذہبی عقیدہ کا استحکام عام ہے، پھر بھی امر واقع ہے کہ اک عورت کے لئے مذہب جہاں اس قدر محبوب چیز ہے وہیں اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ محبت اور انس کامل کے لئے حریص ہے، اس بارے میں اس کے داعیات شہرت تامہ رکھتے ہیں، وہ اس معاملہ میں بے اختیار ہے، اس کے سارے وجود کا اختصار ادعائے محبت اور محبت خواہی ہے یہ جنس بھی اس کو اتنی ہی عزیز ہے، جتنا کہ ایک پاکباز کو مذہب۔ اب ذرا مذہب اور محبت کو آگے رکھ کر عورت کے رجحاناتِ طبع کا تجزیہ کیجئے، یقیناً واقعات کی روشنی میں آپ یہ بھی محسوس کریں گے کہ عورت ہمیشہ محبت کی حمایت کرتی ہے اور اس نے ہمیشہ اپنے میلانِ خاطر کی رعایت ملحوظ رکھی ہے، لیکن یہ بھی اسلام کی ایک خصوصیت کبریٰ ہے کہ وہ اپنے پرستاروں میں اپنا مرتبہ ایسے تشخصات سے بلند رکھتا ہے اور اس قسم کے انسانی تمام جذبات جب اس سے متصادم ہوتے ہیں تو فنا ہو جاتے ہیں، آپ خوب غور کر کے دیکھیں کہ جب کبھی حُسنِ اتفاق سے ایسا موقع آیا ہے کہ جنسِ نازک مذہب اور محبت میں تفریق اور امتیاز کرے تو یقیناً آپ اس کے سوا کچھ نہ دیکھیں گے کہ اس نے اسلام کی عظمت و عزت کا احیاء والقاء چاہا اور اپنے فطری رجحانات کو قطعاً پامال کر ڈالا اور ایسے مواقع پر وہ ہمیشہ تیغِ عریاں ثابت ہوئی۔

پردے کی قید ہی اگر باعثِ ننگ و عار ہے — مرضی تمہاری چھوڑ دو کیا مجھے اختیار ہے

زکیہ نے یہ کہہ کر پھر امتحان و آزمائش کے لئے سر رکھ دیا اور ازمنۂ ماضی کی رسموں کو زندہ کر دیا یعنی ترکِ محبت منظور ہے مگر ترکِ مذہب منظور نہیں۔

مجھے مسرت نہیں غم پسند ہے، مجھے ساز نہیں سوز عزیز ہے، مجھے یہ شوخ خوش کامیاں نہیں چاہئیں،

یہ متین تلخیاں اچھی ہیں، جن میں تم سے دُور، عافیت کے کونے میں تمہارے واسطے تڑپ تڑپ کے جان دیدوں۔

شوکت :۔

سچ کہوں میں اے زکیہ یہ خیال اچھا نہیں ہے سمجھ مجھ میں بھی اتنی سر میں کچھ سودا نہیں
رسم ہے پردہ بزرگوں کی خیال خام ہے اُن پہ یہ بہتان ہے، طوفان ہے، الزام ہے
کہہ رہی ہے ہسٹری اب بھی عرب کا صاف حال تھا برائے نام پردہ اُن میں وہ بھی خال خال
پیروی مقصود ہے ان کی تو ویسا ہی کرو خود مرد مجلس میں اور الزام سب ان پر دھرو
بات ہے وہ کون سی پردے میں جو مستور ہے جہل سے نزدیک لیکن عقل سے تو دُور ہے
یہ اگر منظور ہے تم کو چلو کل میرے ساتھ ورنہ ہے تم کو قسم اب جو لگاؤ میرے ہاتھ

وہ، جو علوم دینیہ سے قطعاً نابلد ہیں اور عاقبت کی فکر جن کے ہاں بے سود ہے وہ جن کے ہاں اس حیات دو روزہ کا صرف یہ مقصد ہے کہ وہ صرف تفریح میں بسر ہو وہ جن کو اسلام سے اتنا بھی تعلق نہیں جتنا تھیاسوفیکل سوسائٹی سے ایک ممبر کو ہوتا ہے، وہ جن کا مبلغ علم فقط بی۔ اے کورس تک محدود ہے اور حد معلومات بندر سے انسان بن جانا کے فلسفہ تک، وہ جن کی قابلیت علمی، سو پچاس انگریزی، اردو، ناولوں کے پڑھ لینے سے زاید نہیں ہے وہ جو خود غرضی سے اپنا تنہا پیٹ پالتے اور میونسپلٹی کی سڑکیں اپنی گاڑیوں سے توڑتے ہیں، وہ جو موٹروں سے اپنے ابنائے جنس کے کچلنے کو روا جانتے ہیں، ہاں وہ جن کو اپنے پیغمبر صلعم سے اتنا بھی تعلق معنوی نہیں، جتنا وہ اک افسانہ و کہانی کے مصنف سے رکھتے ہیں، وہ جنہوں نے پلوٹارک پڑھا، ڈاکٹر جانسن کی لائف پڑھی، سوانح نپولین بونا پارٹ دیکھی اور انسائیکلو پیڈیا کی تمام جلدیں الماری میں دھری ہیں۔ مگر جنہوں نے سید المرسلین کی لائف (نعوذ باللہ) ناول سمجھ کر بھی آجتک نہ پڑھی ہو، ہاں وہ جنہوں نے یورپ کے مصنفین کی جن جن کے تصانیف پڑھی ہیں اور افلاطون، سقراط، فیثا غورث، بطلیموس، اسپنسر، کارلائل، لاک، مل، ہملٹن، برکلے، شیلے، شکسپیر، یہ وہ سب کچھ چاٹا، مگر قرآن کو آج تک ہاتھ نہ لگایا اور وہ جو یہ ادعا رکھتے ہیں کہ ہر کتاب کا مطالعہ اس کے مصنف کی صحبت ہے، مگر مسلمان ہو کر جس کا بخاری نام ہے وہ کتاب نہیں دیکھی، وہ جو یہ نہیں سمجھتے کہ قرآن کا مطالعہ کس کے آگے زانوئے ادب تہ کرنا اور حدیث دیکھنا، کس کی صحبت میں بیٹھنا ہے آج

اسرار علوم شرعیہ اور نکات تاریخ اسلامیہ سے متعلق اُلجھتے ہیں، الحذر، الحذر!!

کیا آپ کے حافظہ میں ۱۹۱۴ء کے اس حادثۂ عظیم کی روداد محفوظ ہے جو پیرس کے مشہور روزانہ اخبار "فگارو" کے دفتر میں واقع ہوا، جس میں فرانس کے وزیر مال کی بیوی نے اڈیٹر فگارو کو خاص اس کے دفتر میں روالور سے قتل کر دیا تھا۔

سچ فرمایئے آپ نے اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا، حقیقت یہ ہے کہ سب آفتیں حد سے زیادہ آزادی اور عورتوں کی بے باکی سے آئی ہیں، اس وقت یورپ کی اعلیٰ طبقہ کی حیاتِ ازدواجی، عیش و محبت سے یکسر محروم ہے گو اس کا ظاہر کتنا ہی روشن کیوں نہ ہو، لیکن اس کے اندر ہیبت ناک رازوں اور خوفناک اخلاقی تاریکیاں پوشیدہ ہیں۔

زکیہ:- سن لیا میں نے مہرباں ہاتھ نہ اب لگاؤنگی
تم سے جو ہاتھ اُٹھا لیا جینے سے بھی اُٹھاؤنگی
تم سے تو عدل ہو چکا تم کو تو رحم آچکا
ہیرے کی یہ کنی، مگر کر دیگی میرا فیصلہ
تم بھی نہ اب لگاؤ ہاتھ لو یہ میں اس کو کھا گئی
پردۂ زیست ہی چلو خوش ہو کہ میں اُٹھا گئی

یہ اشعار جواب ہیں اس محبت شکن تخاطب الفاظ کا جو اس سے پیشتر شوکت نے کہے تھے، پردہ شکنی زکیہ کو منظور نہیں اور پردہ شوکت کو، اور اس پر دھمکی ہے کہ میں تنہا کل چلا جاؤں گا، اور اب مجھے ہاتھ مت لگانا تو اس پر زکیہ کہتی ہے "سن لیا میں نے مہربان ہاتھ نہ اب لگاؤں گی" اور جب تم سے ہاتھ یوں اٹھا لیا تو پھر میری خستہ زندگی، میری حیات، افسردہ بیکار ہے بس یہی مناسب ہے کہ اس سے بھی ہاتھ اُٹھا لیا جائے تم کو رحم نہیں آتا نہ آئے، لیکن اب یہ ہیرے کی کنی میرا فیصلہ کر دے گی، اس ارادہ کے استحکام کو کس پیارے انداز سے ظاہر کیا گیا ہے، "تم بھی نہ اب لگاؤ ہاتھ لو یہ میں اس کو کھا گئی" اس نظم کے آخری اشعار جس قدر دلدوز ہیں، تشریح کے محتاج نہیں:-

جاؤ گے تم یہاں سے جب میں بھی جہاں سے جاؤنگی
یہ بھی نصیب ہے تمہیں مر کے بھی میں نہ پاؤنگی
دل میں تھی آرزو یہی زانو پہ دوں تمہارے جان
آہ یہ کیا نکل گیا میری زبان سے، الاماں!
میری خطا ہو درگذر بھول گئی میں عہد و قول
تم کو ہراس کیا ہے اب جی میں تمہارے کیوں ہے ہول
کیا ہوا میں جو مر گئی سمجھو کہ اک کنیز تھی
ایسی میں زندگی ہی میں کون بڑی عزیز تھی
فکر ہے تم کو اب عبث رنج سے فائدہ ہے کیا
تیر کمان سے چھٹ گیا ہونا تھا جو سو ہو گیا

جائیے اب پلنگ پر عیش کی نیند لیجئے — اور مجھے فرش خاک پر یونہی تڑپنے دیجئے
اس طرح جائیے گا آپ اُٹھ کے یہاں سے صبح کو — حال نہ کچھ کھلے مرا اور خبر نہ گھر میں ہو
ورنہ قیام آپ کو کرنا پڑے گا پھر ضرور — دفن بھی اس کو کیوں کرے جس سے ہو کوئی یوں نفور
ہوتی ہیں متلیاں مجھے اب نہیں تاب گفتگو — بہر خدا نہ کیجئے شور جو تھوکوں میں لہو
دل کے جو ٹکڑے دیکھنا جی کو ذرا سنبھالنا — تھوڑی سی خاک ڈالکر پاؤں سے روند ڈالنا
اب تو میں جاتی ہوں مگر اتنی ہے تم سے آرزو — بچی کا میری آہ، یوں تم نہ بہائیو لہو
ننھی سی اس کی جان ہے ٹوٹے نہ اس کا دل ابھی — پھر نہ شگفتہ پاؤ گے سوکھ گئی جو یہ کلی
ایسا غضب نہ ہو کہیں جا کے اُسے جگا دو تم — ڈر کے کہیں سہم نہ جائے جاگے تو تھپتھپا دو تم
صبح کو ماں کی لاش بھی اپنی وہ دیکھنے نہ پائے — سوتا ہوا سمجھ کے وہ پاس مرے نہ دوڑ آئے
ہوش ہی مجھ میں اب نہیں کیا میں کرونگی اسکو پیار — سونپتی ہوں تمہیں کو میں ہونے نہ پائے دلفگار
جب کبھی اتفاق سے قبر پہ میری ہو گذر — ننھی بھی ساتھ ہو یہ نہ ہو چھوڑ آؤ گھر
جان تھی میری ہائے وہ، آنکھوں کی میری نور تھی — میرے دل فسردہ کی عیش تھی وہ سرور تھی
تم کو نہ اس کا پیار ہو مجھکو تو جان سے تھی سوا — میرے لئے نہ وہ کڑھے بس یہ خیال ہے ذرا
سر پہ جو ہاتھ رکھو گے، ایسا نہ جی کھلائے گی — یاد کرے گی چار دن پھر تو بہل ہی جائے گی
ضبط کی تاب اب نہیں لیجئے آخری سلام — نخل مراد بارور اور نصیب شاد کام

آؤ، اے دردمندانِ ملت، اے رقیق القلب انسانو آؤ، تمہیں دعوتِ بصیرت ہے، تمہیں پیغام عبرت ہے، زکیہ ابھی سات ہی برس کی تھی کہ قدرت کو اسے بن باپ کا کہلایا جانا پسند ہوا، اس کے داغ ہائے یتیمی پر آپ نے اشک حسرت بہائے۔

وہ ابھی نو سال کی پوری نہ ہوئی ہوگی کہ ظالم چچا نے اپنے نافرجام لڑکے سے اس کا عقد کر دیا ابھی دنیا کا کوئی سکھ اور شوہر کا ادنیٰ تلطف بھی نہ دیکھا تھا، اپنی بے شمار دولت کھو بیٹھی، کچھ نہ تھا، شوہر کی مہربانیوں کی توقع تو تھی، آج اس سے بھی ناامیدی ہوگئی، یہ ساری مصیبتیں، یہ تمام آفتیں آٹھ، نو برس میں پوری ہوگئیں، اور بیس اکیس برس کا سن و سال، دلہن کہلائے جانے کے دن، ہاے مرگ مجبور کا پیغام لے کر آئے، عروسِ محبت زکیہ آج رخصت ہوتی اور کیسے عالم یاس میں اور کس حالت مایوسی و حرمانی

امیں ہزاروں ارمانوں کا قتل، سینکڑوں آرزوؤں کی پامالی، اس کا مرگِ ہم مرگ، نہ کسی رفیق کے زانو پر ہے نہ اس کا تڑپنا اور موت کی کڑیاں جھیلنا، کسی محبوب کی گود میں، نہ اس کے سرہانے کوئی غمگسار و چارہ ساز ہے نہ اس کے جذبات آخریں کا کوئی دیکھنے والا۔

اس کی وصیت دل خراش ہے اور اس کی التجا جگر پاش، وہ دُنیا کی ساری لذتوں سے قطعاً محروم چلی ہے، اس نے یہاں کا آرام و لطف کچھ نہ اُٹھایا، اس کا بچپن برباد ہوا اور اس کی جوانی ستم و بیداد سے خاک میں مل گئی، اس کی محسوسات کی شعلہ آرائیوں نے، اس کے جذبات کی آتش طرازیوں نے اس کا خرمنِ ہستی پھونک ڈالا، ہزاروں ارمان اور لاکھوں ولولوں کے لئے جو زندگی اب تک کسی آس پر بسر ہو رہی تھی آج کسی کے آئندہ مستقل آرام و سکون کے لئے قربان کر دی جاتی ہے۔

پھر ہمیں رنج اس کا نہیں کہ زکیہ جس کی دنیائے محبت میں پرستش ہونی چاہیئے تھی، آج اپنے الم تخریب اور غم کس مپرسی سے سینہ چاک ہے، بلکہ افسوس اس کا ہے کہ دُنیا ہر وقت اس نوع کے واقعات پیش کرتی رہتی ہے۔ اور ظالم مرد روز ایسے افسانوں کا مواد فراہم کرتا رہتا ہے۔

خلیقی

کلام شاد

خفا ہو کر رہ و رسم وفا کو اور کم کرتے
شبِ غم کا گلہ کیا مُنہ لگا کر اُن سے ہم کرتے

مقدر، آسمان، خود اپنا دل، سب تو مخالف تھے
بتا ناصح ہم اپنے ساتھ کس کس کو بہم کرتے

بہت چوکے جو مانگی موت آخر کیا علاج اس کا
ستم کرنے کی بھی حد ہے کہاں تک وہ ستم کرتے

چمن میں آکے اے وحشت، تمنا ہی رہی دل کو
تماشائے گل و نسرین و سنبل کوئی دم کرتے

کہاں تک روسیاہی شاد شرم آتی ہے نہیں تم کو
ضعیفی آگئی دُنیا کا لالچ اب تو کم کرتے

نور کی پتلی

ڈرامہ کی ہیروئن، نور کی پتلی (سعیدہ) کفار کے ہاتھوں میں گرفتار ہو کر پریشان ہے، لیکن تثلیث پرستی قبول نہیں کرتی۔ ایک موقعہ پر یہ پیکرِ ناز جوگن کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ نظم اسی وقت کے جلوۂ ناز کی اک تحسین اداشناس ہے۔ رازؔ

آہ، اے سرو رواں، رشکِ نہالانِ چمن   غیرتِ خورشیدِ تاباں، ہے رُخِ زیبا تیرا
محوِ حیرت بن گئی ہے انجمن کی انجمن   روکشِ وادیِ ایمن بن گیا جلوہ تیرا

آہ، یہ نغمہ سرائی اور یہ رقصِ مضطرب   رعشہ براندام جس سے ساری محفل ہو گئی
اے سراپا ناز تو ہے مستیِ بزمِ طرب   سارے عالم کی طبیعت تجھ پہ مائل ہو گئی

کافروں کے ہات میں تو ہے گرفتارِ بلا   ہے صداقت سے مگر لبریز تیری گفتگو
وہ خدا جو ایک ہے، بیشک محافظ ہے ترا   آہ تو نے سچ کہا، حق کی حفاظت میں ہے تو

نورِ وحدت ہے عیاں تیری جبینِ ناز سے   غیر کو سجدہ کرے تو یہ کبھی ممکن نہیں
راستی ہے آشکارا تیرے ہر انداز سے   میری نظروں سے نہیں گذرا ترا ثانی کہیں

یوں لبادہ سے تو نکلی، او جوانی کے سہاگ   ابر کے پردہ سے نکلے برقِ جولاں جس طرح
یہ ادا، یہ جوگ، اور یہ لوٹنے والا بہاگ   پھر تو کہنا ہائے "میں جوگن بنی" ہاں کس طرح

یہ ترا طرزِ تکلم، یہ مدلل گفتگو   اے کلیمِ حسن، تو بیشک سبق آموز ہے
ہے سعیدہ نام تیرا، نور کی پتلی ہے تو   نطق تیری گفتگو سے آج لطف اندوز ہے

نغمۂ وحدت الاپا تو نے جب اے نازنیں   بے خود و مدہوش ہر اک اہلِ محفل ہو گیا
نور سے معمور پا کر یہ تری روشن جبیں   تیرے آگے سر بسجدہ رازؔ کا دل ہو گیا

رازؔ

استفسار و جواب

(۱)

ابونواس (علی گڈہ) - ستمبر کے نگار میں آپ نے ذکرے ابی العلار پر نہایت تشنہ ریویو کیا ہے۔ میں نے بھی ڈاکٹر طہٰ حسین کی اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اور اس کی خوبی کا میں بھی معترف ہوں، لیکن ضرورت تھی کہ آپ تنقید کے سلسلہ میں کچھ اس غریب کا حال بھی لکھ دیتے، کیونکہ بہت سے طلبہ عربی مدارس کے بھی اس شخص کی اہمیت سے آگاہ نہیں ہیں، چہ جائیکہ اردو داں جماعت۔ امید ہے کہ آپ اس جسارت کو معاف فرمائیں گے۔

(نگار) واقعی اس کتاب پر نہایت اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے اور میں خود بھی اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا آپ نے اس ارادہ کو اور تقویت بخش دی، لیکن کیا ابوالعلار کے حالات لکھنے کے لئے ابونواس سے زیادہ موزوں شخص کوئی اور ہو سکتا ہے۔ من انداز قدرت را می شناسم۔ بہر نوع تعمیل ارشاد میں شام کے اس مشہور فیلسوف شاعر کے مختصر حالات قلمبند کرتا ہوں۔

اس کا نام احمد بن عبداللہ بن سلیمان تھا۔ ۳۶۳ھ میں بمقام معرۃ النعمان (جو حلب اور حمص کے درمیان شمال شام کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے) پیدا ہوا۔ یہ عرب کے ایک مشہور خاندان کا فرزند تھا۔ جس کا تعلق قبیلۂ تنوخ سے تھا۔ اس کا دادا قاضی کے عہدہ پر ممتاز رہ چکا تھا، لیکن اس کا باپ معمولی قابلیت کا آدمی تھا۔ اس کی عمر ابھی صرف چار سال کی تھی کہ چیچک میں مبتلا ہوا اور اس کی بینائی جاتی رہی۔ لیکن قوت حافظہ اس بلا کی رکھتا تھا کہ زوال بصارت کی پوری تلافی ہو گئی اور اس کے علمی کارنامے آج اسی طرح یاد کئے جاتے ہیں جس طرح کسی بڑے سے بڑے صاحب بصارت عالم کے۔

ہر چند ابوالعلار کا ابتدائی زمانہ نہایت بے اطمینانی میں بسر ہوا (کیونکہ اس وقت حدود شام، بازنطینی اور فاطمی عساکر کے حملوں کا مرکز بنے ہوئے تھے)، تاہم حالات میں اس قدر انقلاب پیدا نہ ہوا تھا کہ علمی مشاغل بالکل پس پشت ڈال دئے گئے ہوں اور ہر چند سیف الدولہ کا عہد ختم ہو چکا تھا، لیکن وہ مظاہر علمی جو اس کی ذات سے شام میں رونما ہو چکے تھے، ابھی بالکل محو نہ ہوئے تھے۔ اور علمی و ادبی شہرت کے

لحاظ سے شام کی یاد ہنوز لوگوں کے دلوں میں تازہ تھی۔

ابو العلار کی تعلیم، حلب، طرابلس اور انطاکیہ میں ہوئی اور ابن خالویہ مشہور نحوی کے شاگردوں کے سامنے اس نے زانوے ادب تہ کیا۔ ہر چند اس کی ساری تعلیم کا اقتضا رہی تھا کہ وہ متنبی کی طرح، اک مدح گو شاعر کی حیثیت سے ملک میں روشناس ہوتا (اور کچھ دنوں تک وہ اس مصیبت میں شاید مبتلا بھی رہا) لیکن اس کا میلان طبع اس کے خلاف تھا اور جیسا کہ وہ خود سقط الزند میں ظاہر کرتا ہے، اس نے کبھی درہم و دینار کی طمع سے، کسی امیر یا بادشاہ کی مدحت سرائی نہیں کی۔

جب وہ تعلیم کے بعد معرہ (اپنے وطن) واپس آیا، تو وظائف سے، تیس دینار سالانہ اس کا آزوقہ مقرر ہو گیا، طلبہ بھی اس کی کچھ مدد کرتے رہتے تھے۔ ہر چند وطن میں اس کی بڑی عزت تھی، لیکن چند دن بعد یہ یہاں سے دل برداشتہ ہو گیا اور بغداد میں قیام کرنے کی نیت سے چلدیا۔ یہ واقعہ ۳۹۸ھ کا ہے۔ یہاں کے دوران قیام میں، اس کی شہرت اک شاعر کی حیثیت سے بہت عام ہو گئی۔ (یہ متنبی کا بڑا دلدادہ تھا اور اسی کے رنگ میں شاعری کرتا تھا) لیکن پھر اسے وحشت ہوئی اور وطن یاد آیا۔ اور غالباً یہی وہ زمانہ ہے جب ابو العلار کے مذاق میں نہایت ہی مفید انقلاب پیدا ہوا اور اس نے شعر و شاعری کو ترک کر کے زیادہ کار آمد خدمت علم انجام دینی شروع کی۔ چنانچہ وطن واپس آتے ہی اس نے دو کتابیں لزومیات اور رسالۃ الغفران لکھیں جو علمی نقطۂ نظر سے بھی قابل قدر ہیں

بعض کا خیال ہے کہ بغداد سے واپس آنے کے بعد ہی اس کے مذاق کا بدل جانا شاید اس بنار پر تھا کہ اس نے وہاں کے متکلمین سے استفادہ کیا تھا، لیکن خود ابو العلا اس سے انکار کرتا ہے جب ابو العلار گھر واپس آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس واقعہ کا اس کو سخت صدمہ ہوا حتیٰ کہ تارک دنیا ہو کر ایک غار میں رہنے لگا۔ چنانچہ اسی لئے اس کو رھین المحبسین (یعنی دو قید خانوں کا قیدی) کہتے ہیں، ایک قید نابینا ہونے کی اور دوسری زاویہ نشین ہو جانے کی۔

ہر چند وہ کلیۃً ترک علائق کر دینا چاہتا تھا، لیکن علم کے شائقین نے اسے چین نہ لینے دی اور طلبہ دور دور سے اس کے پاس آنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس کی شہرت، اور شہرت کے ساتھ اس کی دولت بڑھنے لگی، یہاں تک کہ جب ۴۳۹ھ میں ناصر خسرو ایران کا مشہور سیاح شاعر اس کی موت سے گیارہ سال قبل) ابو العلار سے ملا ہے، تو اس وقت شہر میں اس کا نہایت زبردست اثر قائم تھا اور بے اندازہ

دولت فقراء و مساکین کو تقسیم کیا کرتا تھا۔

ابو العلاء نے تقریباً چالیس سال خلوت میں بسر کئے، لیکن اس کی کتابوں کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمانہ اس نے بیکار نہیں گذرنے دیا۔ اس کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔

سقط الزند، اس کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ لزومیات (اس کا دوسرا نام لزوم مالا یلزم بھی ہے) یہ بھی اس کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں ایک معلم اخلاق ہونے کی حیثیت سے نہایت آزادی کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ رسالۃ الغفران، یہ ایک خط ہے علی بن منصور حلبی کے نام جس میں عقاید اسلام پر حد درجہ آزاد ہو کر بحث کی ہے۔ علاوہ ان کے اور بہت سی کتابیں اس نے لکھی ہیں جن کی تعداد ساٹھ تک پہونچتی ہے۔

بہت سے لوگوں نے اس کو ملحد و بے دین قرار دیا اور بعض نے تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ اس نے کلام مجید کے جواب میں بھی ایک کتاب الفصول والغایات کے نام سے لکھی تھی، لیکن یہ غلط ہے، کیونکہ رسالۃ الغفران میں اس قسم کی جسارت کرنے والوں کو بُرے لفظوں سے یاد کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اپنے معتقدات کے لحاظ سے وہ بے انتہا آزاد خیال تھا اور سوائے اس کے کہ وہ موحد تھا اور کسی لحاظ سے عام مسلمانوں کے سے عقائد کا پابند نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ الہام و وحی کا بھی قائل نہ تھا اور نہ معاد کو تسلیم کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مرنے کے بعد سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے اور پھر حشر و نشر نہیں ہوتا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اولاد پیدا کر کے انہیں دنیوی مصائب میں مبتلا کرنا سخت حماقت ہے، اسی لئے وہ عورتوں سے بھی کچھ خوش نہ تھا۔ وہ صرف درستی اخلاق کا قائل تھا اور کسی جاندار کو ایذا پہونچانا گوارا نہ کرتا تھا، چنانچہ اسی بنا پر وہ نباتاتی ہو گیا تھا اور گوشت، انڈا، دودھ وغیرہ کھانا ترک کر دیا تھا۔

۴۴۹ھ میں ۱۰ ربیع الاول کو اس نے انتقال کیا۔

(۲)

خلیل الرحمن (حیدر آباد) مجھے عبد اللہ پاشا فکری کے مفصل حالات معلوم کرنے کی ضرورت ہے، براہ کرم مطلع فرمائیے کہ کہاں سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

(نگار) اگر عبد اللہ پاشا فکری سے آپ کا مقصود مصر کا وہ مشہور مدبر ہے، جس نے چودھویں صدی

ہجری کی ابتدا میں انتقال کیا، تو اس کے حالات آپ کو جرجی زیدان کی مشاہیر الشرق اور علی پاشا مبارک کی خطط جدیدہ سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مختصراً میں عرض کئے دیتا ہوں:۔

فکری سنہ ۱۲۵۱ھ میں مکہ کے اندر پیدا ہوا۔ اس کا باپ محمد آفندی مکہ میں اسلحہ کا تاجر تھا اور بعد کو کسی معزز عہدہ پر ممتاز ہو گیا تھا۔ اس کا دادا عبد اللہ جامع ازہر (مصر) کا پروفیسر تھا اور یہ زمانہ وہ تھا جب فرانسیسیوں کا قبضہ مصر پر ہو گیا تھا۔ فکری بھی اپنے دادا کے ساتھ مصر میں رہتا تھا اور جامع ازہر کا طالب علم تھا۔ جب اس کے باپ کا انتقال ہوا، تو اس کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ اس کے کسی عزیز نے اس کی پرورش کا بار اپنے سر لے لیا فکری نے جامع ازہر میں دیگر علوم کے ساتھ ترکی زبان بھی حاصل کر لی۔

سنہ ۱۲۶۷ھ میں یہ ملازم ہوا، سنہ ۱۲۷۹ھ میں اسماعیل پاشا کے ساتھ استنبول گیا، سنہ ۱۲۸۴ھ میں محمد توفیق، حسن و حسین (شاہزادوں) کا اتالیق مقرر ہوا اور سنہ ۱۲۸۶ھ میں وزیر مال مقرر ہو کر خدیو کی لائبریری بھی اسی کے سپرد ہو گئی۔ اس کے چند دن بعد سیاسی ہنگاموں کی وجہ سے مقید کر دیا گیا۔ جب رہا ہوا تو ملازمت اختیار نہیں کی بلکہ سیر و سیاحت کے لئے نکل گیا۔ سنہ ۱۳۰۰ھ تاریخ انتقال ہے۔

فکری اپنے عہد کا بڑا ادیب تھا۔ اس نے اپنے بعد متعدد کتابوں کے مسودے چھوڑے، جنہیں اس کے بیٹے امین پاشا نے شائع کر دیا ہے۔ الآثار الفکریہ اور ارشاد الالباب الی محاسن اروبا (سفرنامہ) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

(۳)

زوار احمد (لکھنؤ)۔ حال میں خواجہ حسن نظامی صاحب کا ایک مضمون نظام المشائخ میں شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت علی کو روحانی حیثیت سے خلیفۂ اول سمجھتے ہیں۔ اڈیٹر صاحب نظام المشائخ نے اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، جو تسلی بخش نہیں ہے۔ براہ کرم اپنی رائے سے آگاہ کیجئے۔

(نگار) چونکہ یہ مسئلہ بالکل مذہبی حیثیت رکھتا ہے اور ایسی بحث کی طرف منجر ہونے والا ہے جو مقاصد نگار سے علیحدہ ہے، اس لئے میں تفصیلی گفتگو کرنے سے مجبور ہوں۔

اگر آپ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حکومت ظاہری کے لحاظ سے خلیفۂ اول تسلیم کرتے ہیں، تو روحانی

حکومت کے لحاظ سے بھی اولیت کا فخر انہیں کو حاصل ہے، کیونکہ عہدِ خلافتِ راشدہ میں مسلمانوں کا پوپ اور قیصر عیسائیوں کی طرح الگ الگ نہ تھا، بلکہ دینی و دنیوی دونوں حکومتیں ایک ہی شخص سے وابستہ رہتی تھیں اور یہی مسلک ہے احناف کا۔ اس میں زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں۔

میں نے خواجہ صاحب کا وہ مضمون نہیں پڑھا، تاہم مجھے یقین ہے کہ ان کا حضرت علیؓ کو روحانی حیثیت سے خلیفۂ اول کہنا صرف علمِ تصوف کے لحاظ سے ہوگا جس کے مرکز یقیناً وہی ہیں اور یہ دوسری بات ہے۔

(۴)

ام۔ عبدالحمید صاحب (راولپنڈی) ستمبر کے نگار میں "دنیا کا ہولناک مستقبل" دیکھا، لیکن صفحہ ۷ پر یہ سطریں دیکھکر سخت قلق ہوا:۔ "دیکھنا یہ ہے کہ حقیقتاً جنگ کی خواہش کس کو ہے، سوائے ان اصحاب کے جو اپنی زندگی کو افسانہائے خونیں سے وابستہ کرکے غیر فانی بنا دینے کے آرزومند ہیں، یا بعض ان جنگجو طبایع کے جو جنگ کے سلسلہ میں اپنی قسمت آزمائی اور کسبِ دولت کے متمنی ہیں، اور کوئی شخص ایسا نہیں جو امن کے خلاف ہو۔"

کیا میں آپ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ خدائی طاقتوں کو جائز مقاصد کے لئے استعمال کرنا بھی مندرجہ بالا اصول میں شامل ہو سکتا ہے۔ کیا اربابِ سیاست مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، علی برادران، یا غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی جد وجہد بھی اسی تحت میں آسکتی ہے۔ اگر جواب نفی میں ہو، تو مسئلہ جہاد کے متعلق براہِ کرم اپنے خیالاتِ زرین ظاہر کیجئے۔

(نگار) مجھے افسوس ہے کہ آپ نے میرے مضمون کو سیاسیاتِ ہند سے متعلق سمجھا، حالانکہ اس کا تعلق بالکل دول یورپ سے ہے، جو باوجود ادعائے امن پرستی دنیا کے مستقبل کو اور زیادہ ہولناک بناتی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے اربابِ سیاست یا غازی مصطفیٰ کمال پاشا (کثر اللہ امثالہ) کا جد وجہد کرنا اس تحت میں کیونکر آسکتا ہے، جب کہ یہ لوگ حقیقتاً حصولِ امن ہی کے لئے کوشاں ہیں اور جماعتِ اسلامی کا حریتِ رائے، بقاءِ مذہب و قومیت اور دفاعِ ظلم و عدوان کے لئے اپنی تمام مساعی کو صرف کر دینا، یہی ہے جہاد۔

(۵)

ام۔ عبدالحمید صاحب (راولپنڈی)۔ ٹالسٹائی اور اس کے فلسفہ کے متعلق ابھی تک کوئی مضمون

میری نظر سے نہیں گذرا، کیا واقعی مہاتما گاندھی کے اصول ٹالسٹائی کے اصول سے ماخوذ ہیں جن پر ترک موالات کی تحریک قایم ہے براہ کرم روشنی ڈالیں۔

(نگار) ٹالسٹائی پر ایک رسالہ اردو میں جامعہ ملیہ علی گڈھ کے طلعت پبلسٹی بیرو نے شائع کیا ہے۔ اسے پڑھیئے شاید کچھ مفید ثابت ہو۔ انگریزی میں متعدد کتابیں اس موضوع پر موجود ہیں۔

میری رائے میں گاندھی جی کی تحریک ترک موالات کوئی نئی چیز نہیں ہے اور حکومت و سلطنت کے مقابلہ میں اس خاموش حربہ سے کام لینا نہایت قدیم بات ہے، عہد وسطی میں امریکہ کی آزادی اسی سے حاصل ہوئی۔ یقیناً ٹالسٹائی کا فلسفہ یہی ہے اور مہاتما گاندھی صرف اسی فلسفہ کا تجربہ کر رہے ہیں۔

(۶)

بسلسلۂ استفسار شاہ محمد عالم صاحب، ایم اے (پشاور)، ماہ نومبر ۲۲ء

۶۶۔ Entelechy = کمال سے اس کا پورا مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔

۶۷۔ Deductive = استدلالی، بہتر ہے۔

۶۸۔ Decision = فیصلہ معنی کے لحاظ سے غلط نہیں، لیکن جس سلسلہ میں آپ نے اس کا ذکر کیا ہے، اس کے لئے لفظ فتویٰ استعمال کیجئے۔

۶۹۔ Discourse = درس یا تقریر، مناسب نہیں ہے، مقالہ زیادہ فصیح ہے۔

۷۰۔ Anthropomorphists = اس سے قبل میں نے Anthropomorphism کا ترجمہ تجسیم بتایا ہے، اس لئے حسب قاعدہ اس کا ترجمہ مجسمین ہونا چاہیئے، مگر اصطلاح میں اس طبقہ کے لوگوں کو مشبہین کہتے ہیں۔

۷۱۔ World of sense = دنیائے حواس، عالم آب و گل مفہوم کے لحاظ سے غلط نہیں، لیکن اصطلاحی لفظ عالم الشہادہ ہے۔

۷۲۔ World of power = اصطلاحی لفظ عالم قدرت ہے۔

۷۳۔ World of ruling = اس کا ترجمہ عالم ملکوت کیجئے۔

۷۴۔ World of Repairing = عالم جبروت کو کہتے ہیں۔

۷۵۔ Universal Spirit = اس کا اصطلاحی ترجمہ روح اول ہے

۷۶۔ Nearer Heaven = اس سے مراد عمارالذیل ہے۔

۷۷۔ Principles = اصول آپ نے صحیح ترجمہ کیا ہے۔

۷۸۔ Applications = اس کا ترجمہ فروع کیجئے۔

۷۹۔ Pilgrim = اس کا ترجمہ اختلاف محل کے لحاظ سے حاجی یا زائر ہو سکتا ہے، لیکن تصوف کی کتابوں میں یہ لفظ سالک کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔

۸۰۔ Renegade = کا ترجمہ آپ نے مرتد ٹھیک کیا ہے، لیکن Sooth-Sayer کا ترجمہ کاہن کیجئے۔

اولین تنفس بہار

افق کے عنبریں شعلوں میں ہنوز اک وہم رنگین باقی تھا، شام بہاراں کی فضا کیف آلود تھی کہ تیتری، عالم رنگ کی اک بیقرار روح، باغ میں آئی اور ہوا کی فضا کو اپنے حرکات رقصیہ سے متموج کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد یہ نرگس کے پاس گئی اور ایک بوسہ چرا لائی۔ وہ پھر کچھ دیر تک (شاید اپنی اس کامیابی پر) اک مسرورانہ رقص کرتی رہی! اب وہ بار بار اس پھول کو چومتی اور بھاگ جاتی تھی! بوسہ لیتی اور رقص کرتی۔ رقص طویل! رقص کرتی اور بوسہ لیتی۔ بوسہ مدید! وہ اک لرزش تشنگی تھی، اک استقلال اہتزاز تھی۔

ساغر نکہت کے نوش لطیف نے، خود اُسے پنکھڑی بنا دیا تھا۔ وہ اس کی حلاوت کے ساتھ تلخیاں بھی پیئے جا رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ لمحۂ نوشا نوش یہی ہے ۔۔۔ ! آخر کار، افقی طلسم رنگ کی شکست کے ساتھ، یہ تیتری بھی اک پژمردہ برگ گل کی طرح شاخ سے جدا ہو کر نیچے گر پڑی۔ اب نہ اس میں رقص اضطراب تھا، نہ اضطرار رقص، اس کے بازو مضمحل ہو چکے تھے اور تشنگی سیراب!

نرگس کے پھول نے یہ سانحۂ جانگداز دیکھا، مگر نہ دیکھ سکا اور شاخ سے جدا ہو کر اک ہلکی اور مختصر سی عمودی لکیر بناتا ہوا تیتری کے سرہانے گر پڑا! اور اُس شہید بوسہ ہستی کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ گویا گل نرگس اس بوسہ مدید کی تکمیل کر رہا تھا ۔۔۔ ! اب بلبل اپنی نوائے مرتعش سے اس کا نوحۂ ماتم پڑھ رہی تھی، اور ماہتاب کے اشک سیمیں اس غم میں سارے باغ کو نم آگیں بنا رہے تھے!

آہ، اس لئے کہ موسم گل کا ایک مسرور دن، اپنی زرفشتی بازوؤں کی بے چینی کے ساتھ بسر کر سکے، تیتری اپنی ساری زندگی قیمت میں دے دیتی ہے! رنگینی بہار کا نفس اولین، تیتری کی بہار آخریں کی نگہ واپسیں ہے!

ل۔ احمد

انتقاد

خلافت موحدین اُردو ترجمہ ہے علامہ عبدالواحد مراکشی کی کتاب المعجب کا جو خلافت موحدین کے حال میں نہایت مشہور و معتبر تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ اس کے مترجم ہمارے فاضل دوست مولوی محمد نعیم الرحمٰن صاحب۔ ام، اے (پروفیسر عربی گورنمنٹ محمدن کالج مدراس) ہیں، جنہوں نے نہایت خوبی سے حق ترجمہ ادا کیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے زیادہ شگفتہ، سلیس اور بہتر ترجمہ ممکن ہے۔

اُردو کو تراجم کی جس قدر ضرورت ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں، اِس لئے پروفیسر صاحب موصوف کا یہ کارنامہ یقیناً قابلِ صد تشکر ہے کہ انہوں نے ایسے موضوع پر یہ قابل قدر کتاب پیش کی جس پر اس وقت تک اُردو میں کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ یہ ترجمہ نہایت نفیس کاغذ پر ٹائپ سے طبع کرایا گیا ہے اور مجلد شائع ہوا ہے۔ اِس کی فہرست بالکل جدید طریقہ پر طیار کی گئی ہے، جو ایک کتاب کے لئے نہایت ضروری چیز ہے۔

وہ لوگ جنہیں تاریخ سے عموماً اور حالاتِ اندلس و مراکش سے خصوصاً دلچسپی ہے، اُن کے لئے اِس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ یہ کتاب جناب معتضد ولی الرحمٰن صاحب ام، اے نصیر کالج ربانی روڈ لاہور سے چھ روپیہ میں مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں ترجمہ کی تمام خصوصیتوں کے ساتھ ایک کمی بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب تک کوئی شخص ساری کتاب بالاستیعاب نہ پڑھ لے، اسے یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ موحدون کون تھے اور کیونکر دُنیا میں رونما ہوئے فاضل مترجم کو مقدمہ میں خلافت موحدین پر ایک تبصرہ ضرور کرنا چاہیئے تھا تاکہ دیکھنے والے کو پہلے ایک اجمالی علم موحدون کا حاصل ہو جاتا اور وہ ترجمہ کو زیادہ دلچسپی سے پڑھ سکتا۔ امید ہے کہ دوسری اشاعت میں یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔

چونکہ ذکریٰ ابی العلاء المعری کی تنقید پر میں جناب ابو نواس کا طعن سُن چکا ہوں، اِس لئے اس سلسلہ میں میرے لئے ضروری ہے کہ کم از کم ناظرین نگار کو بتا دوں کہ موحدون کون تھے اور ان کی حکومت مراکش میں کیونکر قائم ہوئی:۔

جب سنہ ۴۴۰ھ کے قریب افریقیہ، فاطمیین کی اطاعت سے آزاد ہوا، تو اِس وقت اسپین و مغرب کی مذہبی حالت یہ تھی کہ مالکی فقہ کا عام طور سے رواج پایا جاتا تھا، تاویل و قیاس کا سدباب ہو گیا تھا، قرآن و حدیث پر غور و تامل کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا اور اجتہاد کا دروازہ کلیتہً مسدود ہو چکا تھا۔ یہ تھی اس وقت کی مذہبی حالت جس کی تصویر بربر قوم کے ایک نوجوان طالب علم، ابن تومرت (بانی خلافت موحدین) نے پیش کی ہے۔ ابن تومرت نے مشرق میں نہ صرف امام غزالی کے نظریاتِ مذہب کا مطالعہ کیا تھا، بلکہ اِس نے تمام علماء اشعری کے اصول

نقد اور علامہ ابن حزم کی تحریروں سے بھی کامل استفادہ کیا تھا اس لئے وہ نہایت آزاد خیال مسلمان تھا اور تقلید کا سخت مخالف۔ وہ قرآن، حدیث اور اجماعِ صحابہ سے براہِ راست مسائل کا استنباط کرتا تھا اور صحیح معنے میں بڑا زبردست موحد تھا۔ اس وقت مراکش میں مرابطین کی حکومت تھی جو تومرت اور اس کی تعلیمات کے سخت دشمن تھے۔

تومرت نے اول اول آمر بالمعروف و ناہی عن المنکر ہونے کی حیثیت سے ظہور کیا اور تمام غیر مشروع باتوں کا احتساب علی الاعلان شروع کر دیا۔ آلاتِ موسیقی، ظروفِ شراب جہاں نظر آتے، انہیں توڑ ڈالتا اور نہایت آزادی کے ساتھ حکومت وقت کو بُرا کہتا۔ وہ اِس باب میں اس قدر سخت تھا کہ اس نے ایک دن بادشاہ کی بہن کو جو بے نقاب اس کے سامنے سے گزر رہی تھی، سخت زجر و توبیخ کی۔ اِن تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت اس کی دشمن ہو گئی اور اسے مجبوراً اپنے قبایل کی آغوش میں پناہ لینی پڑی یہاں اس نے قبایل بربر میں تبلیغ شروع کی اور آخر کار ۵۱۵ھ میں مہدی کا لقب اختیار کیا۔ عبد المومن اس کا ایک خاص شاگرد و مونس تھا۔ سب سے پہلے اس نے تومرت کے مہدی ہونے پر بیعت کی اور تمام بربری قبایل کو اس طرف متوجہ کرنا شروع کیا۔ جو سرداران بربر بہ غرض حصولِ علم اس کے پاس آتے تھے، انہیں وہ طلبہ کہا کرتا تھا اور جو اسے اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتے تھے، انہیں وہ موحدون کے نام سے یاد کرتا تھا۔

رفتہ رفتہ اس نے تمام بربری قبایل پر اپنا پورا اثر قایم کر لیا اور انہیں حکومتِ مرابطین سے منحرف کر کے جنگ پر آمادہ کر دیا۔ انہوں نے ٹیکس ادا کرنا، قوانین حکومت کی اطاعت کرنا ترک کر دیا اور بعض افسروں کو مار بھی ڈالا۔ اس کے بعد جب انہوں نے سوس کے گورنر کو شکست دی، تو حوصلے بڑھ گئے اور قرب و جوار کے لوگ مہدی کے ہات پر بیعت کرنے لگے۔ اس وقت تومرت نے تینمل میں ایک دریا کے ساحل پر مکان و مسجد تعمیر کرا کے قیام کر لیا تھا، جہاں دشمنوں کا پہونچنا دشوار تھا۔

۵۱۷ھ میں تومرت نے یہ خیال کر کے کہ اس کی قوت اب زیادہ ہو گئی ہے، امیر المومنین کا لقب اختیار کر لیا اور اپنی فوج کا سردار عبد المومن کو مقرر کر کے مرابطون کے خلاف روانہ کیا، لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد متعدد مرتبہ حکومت اور تومرت کے درمیان جنگ ہوئی، لیکن یقین کے ساتھ ان محاربات کی تاریخیں متعین نہیں ہو سکتیں، کیونکہ مورخین اس باب میں متفق الرائے نہیں ہیں۔ خود ابن تومرت کی تاریخ وفات میں مورخین کو اختلاف ہے۔ علامہ ابن خلدون کا بیان ہے کہ ۵۲۲ھ میں اس نے انتقال کیا اور دیگر مورخین ۵۲۴ھ ظاہر کرتے ہیں۔

جب ابن تومرت کا انتقال ہوا تو اس کی وصیت کے مطابق مشورۂ جمہور سے عبد المومن اس کا جانشین مقرر ہوا۔ اس کے بعد بھی جانشینی عبد المومن ہی کے خاندان میں رہی اور گیارہ افراد اس کے خاندان کے بادشاہ ہوئے، یہاں تک کہ ۶۶۸ھ میں بنو مرین نے مراکش کو فتح کر لیا۔

موحدین کے زمانہ میں تمام شمالی افریقہ معہ اسپین کے ایک ہی سلطنت میں شامل تھا اور تمام صوبوں پر عبد المومن اور شیخ ابو حفص عمر کی اولاد قابض و متصرف تھی۔ ابو حفص عمر ہی تومرت کا نہایت ہی معتمد علیہ معتقد تھا اور تومرت کے انتقال پر اسی نے عبد المومن کی خلافت کے لئے بڑی کوشش کی تھی۔ انہیں خدمات کے سلسلہ میں عبد المومن اور اس کی اولاد نے شیخ کے اولاد کی بڑی قدر کی اور ہمیشہ حکومت میں ان کو برابر کا حصہ دیا۔ عبد المومن کی اولاد سید کہلاتی تھی اور ابو حفص کی شیخ۔ موحدون کی سلطنت ڈیڑھ صدی تک قایم رہی:۔

(۱) محمد بن تومرت (المہدی) سنہ ۵۱۵ھ سے سنہ ۵۲۲ھ یا سنہ ۵۲۴ھ تک۔
(۲) عبد المومن (امیر المؤمنین) سنہ ۵۲۲ھ سے سنہ ۵۵۸ھ تک۔
(۳) ابو یعقوب یوسف (〃) سنہ ۵۵۸ھ سے سنہ ۵۸۰ھ تک۔
(۴) ابو یوسف یعقوب المنصور (〃) سنہ ۵۸۰ھ سے سنہ ۵۹۵ھ تک۔
(۵) محمد الناصر (〃) سنہ ۵۹۵ھ سے سنہ ۶۱۰ھ تک۔
(۶) یوسف المستنصر (〃) سنہ ۶۱۱ھ سے سنہ ۶۲۰ھ تک۔
(۷) عبد الواحد (امیر المؤمنین) سنہ ۶۲۰ھ سے سنہ ۶۲۱ھ تک۔
(۸) العادل (〃) سنہ ۶۲۱ھ سے سنہ ۶۲۴ھ تک۔
(۹) المامون (〃) سنہ ۶۲۴ھ سے سنہ ۶۲۹ھ یا سنہ ۶۳۰ھ تک۔
(۱۰) الرشید (〃) سنہ ۶۳۰ھ سے سنہ ۶۴۰ھ تک۔
(۱۱) السعید (〃) سنہ ۶۴۰ھ سے سنہ ۶۴۶ھ تک۔
(۱۲) المرتضیٰ (〃) سنہ ۶۴۶ھ سے سنہ ۶۶۵ھ تک۔
(۱۳) ابو العلاء (〃) سنہ ۶۶۵ھ سے سنہ ۶۶۸ھ تک۔ [۱]

حیاتِ خسرو — امیر خسرو کے حالات میں ایک رسالہ ہے جسے مولانا شبلی نے مرتب کیا تھا اور جسے اس سے قبل مُلّا محمد الواحدی صاحب نے درویش پریس دہلی سے بیانِ خسرو کے نام سے شائع کیا تھا۔ اب اسے دائرۂ ادبیہ لکھنؤ نے چھوٹی تقطیع پر طبع کرایا ہے۔ مؤلف کا نام اس رسالہ کی خوبی کا ضامن ہے۔ قیمت غیر مجلد ۸؍ مجلد ۱۲؍ ملنے کا پتہ۔ دائرۂ ادبیہ محمود نگر، لکھنؤ ہے۔

مکاتیبِ اکبر — حضرت اکبر الہ آبادی کے اُن خطوط کا مجموعہ جو جناب عزیز لکھنوی کے نام لکھے گئے تھے۔ حضرت اکبر کے خطوط گویا اُن کی باتیں ہیں اور جو شخص اُن سے مل چکا ہے، وہ جانتا ہے کہ اُن کی باتیں کس قدر دلچسپ ہوتی تھیں۔ یہ مجموعہ شائع کر کے دائرہ ادبیہ لکھنؤ نے حقیقتاً زبان کی خدمت انجام دی ہے، لیکن افسوس ہے کہ طباعت و کتابت وغیرہ کی طرف سے ذرا بے اعتنائی کی گئی ہے۔ قیمت مجلد ۱۲؍، غیر مجلد ۱۰؍

---

[۱] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

علیگڈھ میگزین

بلحاظ ترتیب اس رسالہ پر اس وقت تک اتنے دور گزر چکے ہیں اور آئندہ گزرتے رہیں گے کہ مشکل سے کوئی دوسرا رسالہ اس باب میں اس کا ہمسر ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل کا دور جو ہمارے عزیز دوست رشید احمد صاحب صدیقی (ام، اے) کی گل افشانیوں سے وابستہ تھا، یقیناً میگزین کی زندگی کا نہایت شگفتہ حصہ تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ اُن کا اس سے علیحدہ ہونا رسالہ کی کہولت کا آغاز ہوگا، لیکن ہمیں یہ دیکھکر مسرت ہے کہ خواجہ منظور حسین صاحب کا جوان دل و دماغ میگزین کی خصوصیات کو اس حد تک قایم رکھنے میں کامیاب ہوا کہ مشکل سے کوئی شخص رشید صاحب کی جدائی کو محسوس کر سکتا ہے۔

خواجہ منظور حسین، کالج کے اُن چند مخصوص طلبہ میں سے ہیں جو اپنے ذوق علم و ادب کے لحاظ سے نمایاں حیثیت کے مالک ہیں، اس لئے اگر یہ اصول درست (اور یقیناً درست ہے) کہ کسی کالج کا میگزین، طلبہ کالج ہی کے ہات میں ہونا چاہیے، تو غالباً خواجہ منظور حسین سے زیادہ اہل شخص وہاں اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔

خواجہ صاحب کا مرتب کیا ہوا تعطیل نمبر (جولائی تا اکتوبر) ہمارے سامنے ہے اور اس میں وہی دلچسپیاں، وہی رنگینیاں اور وہی ساری باتیں (حتی کہ رشید صاحب بھی) موجود ہیں، جنہیں اس سے قبل ہماری نگاہیں ڈہونڈا کرتی تھیں غلام السیدین صاحب کی "دعوتِ عمل"، مرزا احسان احمد صاحب کی "خصوصیات، تصنیف"، آغا حیدر حسن صاحب کا "پسِ پردہ" ہمارے رشید صاحب کا "پاگل خانہ" اور خود منظور صاحب کی "سیرۃ شناسی" ایسے مضامین نہیں، جنہیں سرسری نگاہ سے دیکھنے کے بعد بھی کوئی شخص متاثر نہ ہو،

ہمیں توقع ہے کہ خواجہ صاحب کی توجہ آئندہ میگزین کو اس سے بہتر شکل میں پیش کر سکے گی اور کم از کم اس وقت تک کہ کالج کے احاطہ میں وہ اپنی متعلمانہ زندگی بسر کر رہے ہیں، میگزین کو جو روایات کالج کی اک اچھی روایت اور اردو صحافت میں رشید صاحب کی بہترین یادگار ہے، مضمحل نہ ہونے دیں گے۔

ہمایوں

لاہور کا ماہوار رسالہ جو جنوری سنہ ۲۲ء سے اس وقت تک نہایت پابندی کے شائع ہو رہا ہے۔ اس کی عنانِ ادارت ہمارے محترم دوست میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے، بیرسٹرایٹ لا کے ہات میں ہے جو اجراءِ ہمایوں سے پہلے بھی ادبی دنیا میں اپنے ذوق کی پاکیزگی کا کافی ثبوت دے چکے ہیں۔

یہ رسالہ میاں صاحب موصوف نے اپنے والد محترم جسٹس شاہ دین مرحوم کی یادگار میں جاری کیا ہے جو ہمایوں تخلص فرماتے تھے اور یقیناً پنجاب کے اُن مخصوص افراد میں سے تھے، جنہیں ادب اردو کے ساتھ نہایت گہری دلچسپی تھی اور اس کی اعانت و ترقی میں کافی حصہ لیتے تھے۔

یہ رسالہ اپنی ترتیب و تہذیب، اپنے مضامین کے لحاظ سے پنجاب کا ممتاز رسالہ ہے اور اس وقت تک اس میں اچھے اچھے مضامین شائع ہو چکے ہیں، علی الخصوص "فن قصہ نویسی" کہ اگر ہمایوں اپنی ایک سال کی عمر میں صرف یہی ایک مضمون شائع کر دیتا، تو بھی تسلیم کرنا پڑتا کہ اس نے ادب اردو کی کافی خدمت انجام دی ہے۔ میاں صاحب موصوف کے وہ ادبی مضامین جنہیں بجا طور پر شعر منثور کہا جا سکتا ہے، خصوصیت کے ساتھ قابل داد ہیں۔ ضخامت ۸۰ صفحات تقطیع بڑی، طباعت و کتابت بغایت پسندیدہ۔ قیمت پانچ روپیہ سالانہ۔

ہزار داستان پندرہ روزہ رسالہ ہے جو اردو میں فن افسانہ نویسی کو مقبول بنانے کے لئے لاہور سے جاری ہوا ہے۔ اس کے اڈیٹر جناب حکیم احمد شجاع (بی۔ اے) ہیں، جو قدرت کی طرف سے افسانہ نویسی اور ڈرامہ نگاری کا نہایت پاکیزہ ذوق لے کر آئے ہیں اور اجرا ہزار داستان سے قبل بھی وہ اس باب میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس وقت تک اس کے دس نمبروں میں متعدد افسانے شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے بعض نہایت دلچسپ ہیں۔ سدرشن، پطرس، پریم چند، تاج، جو اس وقت ہندوستان کے بہترین فسانہ نگار ہیں اس رسالہ میں مستقلاً لکھتے رہتے ہیں۔ اس میں کبھی کبھی رنگین تصاویر بھی شائع ہوتی ہیں اور طباعت و کتابت میں خصوصیت کے ساتھ اہتمام کیا جاتا ہے۔ وہ حضرات جو تھکے ہوئے دماغ کو ادب لطیف کے مطالعہ سے سکون پہونچانا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ رسالہ اک اچھا مونس و ندیم ہے۔ حجم ۲ جزو تقطیع بڑی، قیمت آٹھ روپیہ سالانہ۔

نونہال ہفتہ وار رسالہ ہے جو بچوں کے لئے لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے اڈیٹر بھی مسٹر حکیم احمد شجاع ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ رسالہ بچوں کے لئے اک نعمت ہے جو نہایت بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار کرتے ہیں۔ سرورق خصوصیت کے ساتھ غیر معمولی طور پر خوشنما اور دلکش طیار کرایا گیا ہے تاکہ بچوں میں اس کے مطالعہ کا ذوق پیدا ہو۔

اس وقت ہندوستان میں علاوہ نونہال کے بچوں کے لئے دو رسالے اور ہیں، جن میں سے ایک سعید ہر پندرہ دن کے بعد کانپور سے اور دوسرا پھول ہفتہ وار لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پھول نہایت کامیاب رسالہ ہے اور بچوں کے لئے نہایت دلچسپ لٹریچر پیش کرتا رہتا ہے، اسی کے ساتھ طباعت و کتابت بھی پاکیزہ ہوتی ہے، لیکن نونہال کا معیار پھول سے ذرا بلند ہوتا ہے اور زیادہ ذی ہوش بچے اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ سعید یقیناً باعتبار مضامین بہت مفید ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس کا کاغذ اچھا نہیں ہوتا۔ ہماری رائے میں ہر بچوں والے گھرانے میں جس طرح سعید اور پھول کا آنا ضروری ہے، اسی طرح نونہال کا آنا بھی لازم ہے۔ قیمت سالانہ چھ روپیہ۔

شفق مدراس کا ایک ماہوار رسالہ ہے، جو ستمبر ۲۲ء سے حضرت مہاجر کی اڈیٹری اور مولوی محمد نعیم الرحمٰن ام، اے

(پروفیسر عربی گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس) کی سرپرستی میں شائع ہو رہا ہے۔

جناب مُہاجر، مدراس کے نہایت ہونہار جوان ہیں اور مولوی محمد نعیم الرحمٰن صاحب بھی حلقہ علم و ادب میں اک مخصوص امتیاز رکھتے ہیں۔ یہ حضرات مدراس میں (جہاں اشاعت اردو کی سخت ضرورت ہے) عرصہ سے زبان کی خدمت انجام دے رہے ہیں، جسے اب انہوں نے اجراءِ شفق سے زیادہ وسیع بنانے کا عزم کیا ہے۔

اس رسالہ میں علم و ادب اور تاریخ وغیرہ کے اچھے اچھے مضامین ہوتے ہیں اور ہر مہینے لزوماً ایک تصویر بھی ہوتی ہے اگر یہ رسالہ خود اپنی خصوصیات ترتیب کے لحاظ سے قابل قدر نہ ہوتا، تو بھی ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا اخلاقی اور لسانی فرض تھا کہ ہر طرح اس کو مدد دیتے اور کارکنان شفق کی خدمت کا اعتراف عمل سے کرتے۔ حجم چار جزو، قیمت چار روپیہ سالانہ،

ملنے کا پتہ:۔ منیجر شفق ٹرپلی کین (Triplicane) مدراس ہے

ترقی

حیدرآباد کا ماہوار مجلہ ہے جو جناب ابوالمکارم صدیقی کی اڈیٹری میں ربیع الاول سے جاری ہوا ہے۔ پہلا پرچہ ہمارے سامنے ہے اور اس کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ دکن کے اس رسالہ کا مستقبل بہت امید افزا ہے۔ اس اشاعت میں صرف تین مضامین ہیں اور تینوں اچھے ہیں۔ سرورق کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں "ادبی، تاریخی، معاشی، اور تعلیمی مضامین ہوا کریں گے"۔ لیکن کیا صرف ۴۸ صفحات کا رسالہ اس قدر متنوع المباحث مقصد کو پورا کر سکتا ہے۔ ضرورت تھی کہ ابوالمکارم صاحب کم از کم ۸۰ صفحات پر اس کو شائع کرتے اور خط بھی ذرا باریک کرا دیتے۔ طباعت و کتابت نہایت پاکیزہ ہے۔ قیمت پانچ روپیہ سالانہ

ندیم

بھوپال کا ماہوار رسالہ ہے، جو جناب سعید رزمی کی اڈیٹری میں اکتوبر سے شائع ہوا ہے۔ اس کے مضامین سے مرتب کی سنجیدگی ذوق عیاں ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اگر وہ جاری رہا تو زبان کی خدمت میں کافی حصہ لے گا۔ تقطیع بڑی ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت چار روپیہ سالانہ۔ **ملنے کا پتہ:۔** منیجر ندیم بھوپال ہے۔

الکمال

ماہوار رسالہ ہے جو جناب ریاض شروانی کی اڈیٹری میں لاہور سے جاری ہوا ہے۔ اس کا پہلا نمبر بابت ماہ نومبر کا ہمارے سامنے ہے۔ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس میں تجارت، طب، صنعت، حرفت، مذہب، ادب، تاریخ وغیرہ سبھی کچھ ہوگا، لیکن پہلے نمبر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصود زیادہ تر صرف طبی معلومات پیش کرنا ہے۔ اور اس سلسلہ میں غلام جیلانی صاحب کا مضمون "طب کی پیدائش" خوب ہے۔ ضخامت ۳۲ صفحات، تقطیع بڑی، قیمت چار روپیہ سالانہ

مشیر الاطباء

طبی رسالہ ہے جو حکیم محمد حسن صاحب قرشی کی اڈیٹری میں لاہور سے جاری ہوا ہے۔ حکیم محمد حسن صاحب اس کو مفید و دلچسپ بنانے میں بہت محنت و کاوش صرف کر رہے ہیں اور فن طب کے متعلق جدید معلومات بھی فراہم کرتے ہیں۔ لکھائی چھپائی نہایت پاکیزہ ہے۔ تقطیع اوسط، حجم ۴۸ صفحات، قیمت قسم اول ۱۲؍ ہے، قسم دوم ۱؎

معین الصحت یہ بھی طبی رسالہ ہے جو دہلی سے جاری ہوا ہے۔ اس کے اڈیٹر حکیم محمد مظفر علی صاحب رسالہ کی ترتیب میں بہت کوشش سے کام لیتے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ پبلک جلد اس رسالہ کی طرف متوجہ ہو جائے گی قیمت تین روپیہ سالانہ ضخامت چالیس صفحات

شراب و افیون کے نقصانات مسٹر اینڈروز کے بعض انگریزی مضامین کا ترجمہ جسے ڈاکٹر محمد عبدالغفور صاحب بسمل نے شائع کیا ہے ترجمہ سلیس و بامحاورہ ہے۔ کتاب کے نام سے اس کا موضوع ظاہر ہے۔ یہ رسالہ چار آنہ میں ڈاکٹر صاحب مذکور سے ذریعہ پوسٹ ماسٹر سہارنپور مل سکتا ہے۔

مکتوبات فرنگ ۱۸۵۷ء کے ناکام ہنگامۂ انقلاب میں ایک انگریز کو نانا کے اسباب میں چند خطوط کسی انگریزی خاتون کے مل گئے تھے، جو اظہار تعشق میں نانا کے نام لکھے گئے تھے۔ ان خطوط کے پڑھنے سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے نانا سے کس قدر شغف تھا، بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نانا کو کس طرح انگریزوں کا طرفدار بنانا چاہتی تھی۔ ان خطوط کا اردو ترجمہ مکتوبات فرنگ کے نام سے ڈاکٹر محمد عبدالغفور صاحب بسمل نے شائع کیا ہے اور دیکھنے کے قابل ہے۔ اس مجموعہ میں دو خط نانا کے بھی ہیں، جو اس نے اپنی محبوبہ کے نام لکھے تھے۔ یہ مجموعہ مترجم سے ذریعہ پوسٹ ماسٹر سہارنپور بارہ آنے میں مل سکتا ہے۔

شاہی دواخانہ بھوپال کی دوائیں بھوپال میں ایک شاہی دواخانہ قائم ہے جس نے چند دوائیں عرصہ ہوا ہمارے پاس ریویو کے لئے بھیجی تھیں، لیکن چونکہ ہم نے اُن کا تجربہ نہ کیا تھا اس لئے کوئی رائے اس وقت تک نہ دے سکے۔ اب بعض دواؤں کا تجربہ ہمیں ہو چکا ہے، اس لئے اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔

۱۔ (اعجاز طب) کسی بوٹی کے بیج ہیں، جن کے متعلق منیجر شاہی دواخانہ کا دعویٰ ہے کہ اس کے تین دن کے استعمال سے یقیناً استقرار حمل ہو جاتا ہے اور اولاد نرینہ پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے دو ایسے آدمیوں پر جن کی دس سال کی حیات ازدواجی میں کوئی اولاد نہ ہو سکی تھی، اس دوا کا تجربہ کیا اور بالکل صحیح پایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے عالم نباتات میں کس طرح اپنی قوتوں کو مضمر کر دیا ہے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ جن حضرات کو اس دوا کی ضرورت ہو وہ منیجر شاہی دواخانہ بھوپال سے خط و کتابت کریں۔ اس کی قیمت کا ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔

۲۔ (جوارش شاہی) دل و دماغ کی تقویت اور قوت اعصاب کے لئے ہم نے اس کے اثرات کو بہت مفید پایا۔ اس کے اثرات کو دیکھتے ہوئے اس کی قیمت پانچ روپیہ فی سیر بہت کم ہے۔

۳۔ (منجن شاہی) اس منجن کو ہم نے اور ہمارے بعض احباب نے استعمال کیا اور مفید پایا۔ اس سے دانت اور منہ کی اکثر بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔ اس کی قیمت پانچ روپیہ فی سیر مقرر کی گئی ہے جو ذرا زیادہ ہے۔

علاوہ ان کے اور بھی بہت سی دوائیں اس دواخانہ میں مختلف امراض کے لئے موجود ہیں، جن کا ہم نے تجربہ تو نہیں کیا، لیکن اُن کی مقامی شہرت سے اُن کا مفید ہونا ثابت ہوتا ہے۔

حافظ امام الدین پبلشر نگار نے باہتمام خواجہ صدیق حسین مطبع اگرہ اخبار آگرہ میں چھپوا کر شائع کیا

روح نظیر

یعنی

میاں نظیرؒ اکبرآبادی کے منتخب کلام کا مجموعہ

جس کو

سید محمد محمود رضوی بی اے مخمور اکبرآبادی نے

مع ایک بسیط مقدمہ و تبصرہ کے نہایت کاوش و تحقیق سے مرتب کیا ہے چھپکر تیار ہو گئی ہے علاوہ ایک پر مغز دیباچہ اور ایک پر معنی مقدمہ و تبصرہ کے جن سے نظیر کے شاعرانہ کمال پر تحقیقی روشنی پڑتی ہے کتاب کے آخر میں فرہنگ و حواشی اضافہ کر کے کلام کے معنوی مشکلات و تلمیحات کو حل کیا ہے اور اسکے ساتھ متروکات و مصطلحات پر گہری نظر ڈالی ہے کلام نظیر کی صحت میں جس دقت نظر سے کام لیا گیا ہے وہ صرف مطالعہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے یہ کتاب معنوی لطائف کے علاوہ صوری محاسن کا ایک نظر فریب مرقع ہے۔ اس کتاب کی ترتیب جو بالکل جدید انداز و طریق ادارت پر کی گئی ہے دلدادگان ادب کے لئے خاص دلچسپی رکھتی ہے تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ ضخامت ۴۰۰ صفحہ۔ سرورق رنگین کاغذ چکنا ولایتی ۲۸ - پونڈ کتابت و طباعت دیدہ زیب قیمت علاوہ محصولڈاک عگ

تصنیفات مولانا نیاز فتحپوری		دارالاشاعت سیاسات مشرقیہ کی کتابیں	
گہوارۂ تمدن	عگ	خلافت اسلام مصنفہ مولانا محمد سلیمان ندوی	عمر
قربانگاہ حسن	۸/	سمرنا میں یونانی مظالم	عمر
تلاش راز	۱۲/	حوادث سمرنا	۲/

ملنے کا پتہ — دارالاشاعت نگار، لکھنؤ

"ہزار داستان و نونہال"

تمام ہندوستان میں صرف ہزار داستان ہی ایک پندرہ روزہ باتصویر رسالہ ایسا ہے جسکو اردو زبان کی افسانوں ڈراموں اور قدیم و جدید شاعری کا بہترین مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح بچوں کے لئے صرف نونہال ہی ایسا ہفتہ وار باتصویر رسالہ ہے جو اپنی تمام ظاہری خوبیوں اور باطنی فائدوں کے اعتبار سے سارے ہندوستان میں کوئی دوسری نظیر نہیں رکھتا۔

چندہ سالانہ "ہزار داستان" قسم اول آٹھ روپیہ سالانہ قسم دوم چھ روپیہ سالانہ قسم سوم (بلا تصویر وٹائٹل) چار روپیہ سالانہ۔

چندہ سالانہ "نونہال" قسم اول چھ روپیہ سالانہ قسم دوم (بلا ٹائٹل) چار روپیہ سالانہ۔

دونوں رسالے دار الاشاعت ادب لطیف لاہور سے

طلب فرمایئے

جرمن الگزیر

(جرمن اکسیر)

اس ترقی یافتہ زمانہ میں یہ نوایجاد روغن اپنی نوع کی تکمیل ہے جملہ مخصوص مردانہ !! اعصابی امراض کے لئے حکمیہ مفید ہے اور عجیب و غریب اثرات سے مملو ہے۔ امتحان فرما کر یقین کیجئے۔ چھ ماشہ علاوہ محصولڈاک

میگناٹین

(مقناطیسی)

نہ صرف ضعف و رقت کا شرطیہ علاج بلکہ تندرست اصحاب کے لئے بھی ان گولیوں کا استعمال از بس فائدہ رساں ہے جرمن الگزیر کے ہمراہ اس کا استعمال فرما کر نتیجہ دیکھئے۔ ۲۱ گولیاں علاوہ محصولڈاک تین روپیہ۔ چالیس گولیاں پانچ روپیہ۔

شیرِ مادر

سچ ہے ہندوستانیوں کے بچے "بے پروائی ہی کے سایے میں پلتے ہیں" قدرت کی شان ہے کہ وہ مشرق میں نسل انسانی کو قایم رکھنا لازمی سمجھتی ہے۔ ورنہ ماں باپ حمل قرار پانیکے وقت سے لیکر دودھ چھڑانے تک بلکہ اُسکے بعد تک بچے کی ایذا رسانی میں کوئی کسر نہیں رکھتے۔ اہل مغرب کا اسکے بالکل برعکس عمل ہے بمغرب کے شعرا تک بچہ کو باپ سمجھتے ہیں چنانچہ ورڈ سورتھ کو ملٹن کا قول ہے کہ بچہ آدمی کا باپ ہے" یعنی جس طرح ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوتا ہے اسیطرح بچپن سے آدمی بنتا ہے ماں باپ کی بے احتیاطیوں کا بچے پر کیا اثر ہوتا ہے مجملاً سنو چیدہ بتفصیل سے دل دکھتا ہے حمل اور دودھ پلانے کے زمانہ میں عورت کو آزادانہ چھوڑ دینے سے رحم میں فتور اور دودھ میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ ہاضمہ کمزور اور اُسکے ساتھ بچہ ناتوان ہو جاتا ہے کھانسی۔ بخار۔ دست وغیرہ شروع ہو جاتے ہیں۔ آنکھوں سے چیپ منھ سے رال جاری ہے۔ ماں سمجھتی ہے کہ بچے ایسے ہی ہوتے ہیں اسیطرح رفتہ رفتہ سوکھا لگجاتا ہے۔ ایک ذرا ہوا زوگی ہوئی اور پسلی کے مرض اُبل آئے۔ سینہ در پیٹ دکھنے لگا والدین کی بڑتی دوڑ یہ کہ سہاگا کچا یا پکا دیدیا اور بس یہ خیال باندہ لیا کہ بچے یونہی پلا کرتے ہیں یہیں بچوں کو بڑوں سے بہت زیادہ احتیاط اور خدمت کی ضرورت ہے یہ بات ناک چنے چبوا کر پلتے ہیں یا ایک نہایت آسان طریقہ پرورش ہم بتا دیتے ہیں احسان جمیعنی کا شیر مادر استعمال کیجیے۔ پھر جو چاہے کیجیے۔ قدرت اور یہ شربت دونوں ملکر بچے کی پرورش آپ کرینگے اثر میں آب حیات ثابت ہوا ہے پسلی کا چلنا۔ سانس کی بیماری۔ سوکھا لگجانا۔ مسان۔ معمولی کھانسی۔ قبض۔ بدہضمی۔ اپھارا۔ پیٹ کا درد۔ قسم قسم کے دست۔ لکانا۔ مروڑ۔ کانچ کا نکلنا۔ دودھ ڈالنا۔ ہر وقت روتے رہنا۔ آنکھیں دکھنا۔ کان کا درد۔ ہر قسم کا بخار۔ ہر بیماری میں بلا خوف بچوں کو استعمال کرا سکتے ہیں قیمت فی شیشی ۱۲ / ۔ چھ شیشی عہ / ۔

قوبا

ستایا داد نے ہے شکوہ بیداد کیا کیجیے ؛ کہیں قوبا نہیں ماتا ہمیں استاد کیا کیجیے

داد بھی جیب کیطرح جلدی بیماری ہے اور دیمک کیطرح اندر ہی اندر پھیلتا جاتا ہے اگرچہ یہ کئی قسم کا اور مختلف اسباب سے ہوتا ہے کبھی جانے جیب نکالکر پھنسیاں ہو جاتی ہیں (قوبا) اسکے کیڑے اور مواد کو چند بار لگانے سے بھوسی کیطرح اُڑا کر جلد کو صاف کرتا اور روح کو آرام دیتا ہے شاید قوبا سے زیادہ اس مرض کی کوئی اور دوا مجلی نہوگی۔ ترکیب استعمال ہر شیشی کے ہمراہ ہوگی خوبی یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسی تیز دوا شامل نہیں ہے جو شفائی ہی سوزش پیدا کرکے نئی تکلیف کا سبب ہو آزمایش شرط ہے قیمت فی شیشی آٹھ آنہ ۲۴ شیشی عہ۔ ایک درجن للعہ محصولڈاک علاوہ۔

ضم

بیسویں صدی کی ایک نئی ایجاد

مریضوں پر تجربہ کرنے اور اسمیں کامیاب ہونے کے بعد آج ہم نہایت خوشی اور دلیری سے عامہ خلایق کے سامنے ضم کی ایک شیشی پیش کرتے ہیں بلا شبہ اسکا اثر جادو کا حکم رکھتا ہے ہمارا کارخانہ ۱۸۷۰ء سے قایم ہے اپنی ادویات کے معتمد ہونے کے لحاظ سے مشہور زمانہ ہے کارکنان کارخانہ کی سالہا سال کی محنت کا نتیجہ یہ ضم ہے جو آج پیش کیا جاتا ہے گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

انسان کے کسی عضو مثلاً سر۔ پیشانی۔ ناک۔ دانت۔ کان۔ گردن۔ سینہ۔ پسلیاں۔ پشت۔ بازو۔ کلائی۔ انگلی۔ ران۔ پنڈلی۔ ٹخنہ۔ ایڑی۔ تلوا۔ ہنگو بٹھے میں خواہ کسی قسم کا درد کیوں نہو گٹھیا کا درد ہو یا سوجن ہو یا کسی زہریلے جانور نے کاٹا ہو غرض ہر قسم کے درد کو یقیناً اور بلا شبہ یہ ضم اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور یہی ارادہ ہے کہ اوکو جو تجربہ کا امتحان کے بعد آپ بھی ہمارے دعوی کی تائید کرینگے قیمت فی شیشی کلاں ۱۲ / ۔ خورد ۱۲ / ۔ علاوہ

کلکتے کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کی مجرب و آزمودہ دوائیں

ہماری دوائیں ہر جگہ ایجنٹوں اور دوافروشوں کے پاس ملتی ہیں محصولڈاک علاوہ

چالیس سال سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو رہی ہیں

منفصل حالات کی فہرست اور بیکار فوری جنتری منگوا کر دیکھئے محصولڈاک علاوہ

وہ زندگی ہی کیا!

جس سے ایک دوسرے فائدہ نہ پہونچ سکے اسی خیال کو مد نظر رکھکر دوائیں بنی ہیں اور باوجود انمول فائدہ کے سستی بکتی ہیں

نام دوا مع قیمت

اصلی عرق کافور ہیضہ کے لئے ایک ہی دوا ہے قیمت ۱۶

دمہ کی دوا۔ ایک ہی خوراک میں دمہ کو دبا دیتی ہے قیمت عہ

کونین کی گولیاں چار گرین کی ۲۵ گولیاں قیمت ۱۲

کولا ٹانک۔ کمزوری کا دشمن قیمت ۱۲

فصلی بخار و تجال کی دوا۔ چار پانچ ہی خوراک میں بخار کا آنا بند ہو جاتا ہے قیمت فی شیشی کلاں عہ خرد ۱۰

مقوی باہ گولیاں۔ جیسا نام ویسا فائدہ قیمت عہ

ہین ہیلر اندرونی و بیرونی درد کی دوا قیمت عہ

سارسہ خون صاف کرنے کی دوا قیمت عا

سمپی لائین خونی بواسیر و خون بند کرنے کی دوا قیمت عہ

پرانی سوزاک کی دوا پرانے سے پرانا سوزاک ایک شیشی میں آرام ہوگا قیمت عام

گرمی آتشک کی دوا یہ گرمی کے زہر کو نکالدیتی ہے قیمت عا

دانت کے درد کی دوا دوا لگاتے ہی درد تھم جاتا ہے قیمت ۶

سر درد کی دوا سر درد کے لئے نہایت اکسیر ہے قیمت ۱۲

جلاب کی گولیاں آسانی سے پیٹ کو صاف کرتی ہے قیمت ۹

داد کا مرہم ایک ڈبیہ میں کیسا ہی داد ہو آرام ہو جائیگا قیمت ۶

کلورالڈوائین ہیجیش کی حکمی دوا قیمت ۸

کھانسی کی دوا تف اور کھانسی کیلئے مفید ہے قیمت کلاں عہ خرد ۱۰

نام دوا مع قیمت

پرانے ملیریا بخار کی گولیاں ان گولیوں کو نمین نہیں ہے قیمت عہ

روغن پیپرمنٹ بدہضمی اور ریاحی درد کیلئے مفید ہے قیمت عہ

کان بہنے کی دوا کان کا بہنا اس سے بند ہو جاتا ہے قیمت ۶

زخم کا مرہم ہر قسم کے زخم کیلئے مفید ہے قیمت ۱۰

لال شربت ایک شیشی پینے سے لال ہو جاتے ہیں قیمت عہ

خارش کی دوا یہ ہر قسم کے جلدی امراض کیلئے مفید ہے قیمت ۱۲

امراض مستورات کی دوا یہ حیض کی خرابی کیلئے مفید ہے قیمت عہ

عرق پودینہ یہ پودینہ کی ہری پتیوں سے بنا ہے بدہضمی کیلئے مفید ہے قیمت ۱۲

نمونہ کی بکس جس میں ڈاکٹر ایس کے برمن کی چند مشہور دوائیں ہوتی ہیں قیمت عام

سنہرہ سینٹ یہ خوشبوؤں کا بادشاہ ہے قیمت عہ

کسراج تیل یہ تیلوں کا سرتاج ہے دیسی اور ولایتی خوشبوؤں کی آمیزش سے بنایا گیا ہے اور خوشبو کے علاوہ دماغ کے لئے نہایت مفید ہے قیمت عہ

ہیل یاک مجموعہ ہر قسم کی زخم چوٹ ہر ایک کے لئے حکمی دوا ہے قیمت ۱۰

کرونیج یہ معجون گشتہ سات ہی خوراک میں قوی کو ہر رنگ پر لے آتا ہے قیمت ۷ خوراک عہ

آلوکا یعنی رقیق التایہ بنگالے کا خاص تحفہ ہے کسی حسین معشوق کی گورے گورے پیروں میں لگائیے اگرچہ بوٹ نہ جائے تو ہمارا ذمہ قیمت ۸

انگریزی ہندی اور اردو تھرمامیٹر یہ ڈاکٹر ایس کے برمن کی خاص فرمائش سے ولایت کے ایک نامی کارخانہ سے بنکر آیا ہے اور بخار پہچاننے

[illegible]

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

تار کا پتہ کمفر — یہ کارخانہ سنہ ۱۸۷۴ء سے جاری ہے — پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴

ادبی انقلاب

رسالہ ہمایوں لاہور - بالتصویر

آنریبل خان بہادر میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم سابق جج چیفکورٹ پنجاب کی یادگار میں

ان کے خلف الرشید میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا نے مستقل سرمایہ سے ایک بے نظیر ماہوار ادبی رسالہ "ہمایوں" اپنی اور بلیغ الملک علامہ تاجور محمد نجیب آبادی فاضل دیوبند کی اڈیٹری میں ماہ جنوری ۱۹۲۲ء سے جاری کیا ہے۔ یہ رسالہ دلکش افسانوں دلچسپ تاریخی و علمی مضامین و لفریب مضمون کا البم بنکر شائع ہوتا ہے۔ ہمایوں کے بہت سے مشہور انشا پرداز ایسے ہیں کہ انکے مضامین صرف ہمایوں ہی کے صفحات میں نظر آئیں گے۔ چونکہ اسکے اجراء سے تجارت مقصود نہیں یہ صرف آنریبل جسٹس مرحوم کی یادگار کے طور پر مستقل سرمایہ سے جاری کیا گیا ہے اسلئے اسکے بند ہونے کا قطعی اندیشہ نہیں اسکی ظاہری و باطنی خوبیوں پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑے سائز کے کم سے کم بہتر (۷۲) صفحات کا حجم لکھائی چھپائی اور کاغذ بہتر سے بہتر ہر ماہ تاریخی یا کسی مشہور اہل قلم یا آرٹ کے متعلق کوئی تصویر شائع کیجاتی ہے۔ مشرقی و مغربی معلومات اور علمی ادبی دلچسپیوں کے دود ریا ہمایوں کے کوزے میں بند ہوتے ہیں صحت زبان و محاورات کے اعتبار سے اسکا پایہ بہت بلند ہے۔ محفل ادب کے عنوان کے تحت ہندوستان و بیرونی ممالک کے اردو۔ ہندی۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ عربی۔ فارسی۔ انگریزی زبان کے مشہور رسالوں سے دلچسپ مضامین کا اقتباس شائع کیا جاتا ہے اسکے مخصوص قلمی معاونین میں سے چند کے اسمائے گرامی درج کئے جاتے ہیں۔ آنریبل شیخ عبدالقادر جج ہائیکورٹ لاہور۔ آنریبل سر محمد شفیع کے۔ سی۔ ایس۔ آئی وزیر تعلیم گورنمنٹ ہند۔ نواب حیدر یار جنگ بہادر۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں سی۔ آئی۔ ای۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال۔ خواجہ حسن نظامی وغیرہ ہمایوں کے متعلق مشاہیر اہل قلم گورنمنٹ کے منتخب اخبارات و رسائل نے بہت اعلیٰ رائے قائم کی ہیں۔ قیمت سالانہ پانچ روپیہ۔ ششماہی تین روپئے۔ نمونہ کا پرچہ ۸؍ (علاوہ محصولڈاک) منشی محمد صادق منیجر رسالہ ہمایوں (بر کوٹھی میاں بشیر احمد بیرسٹر ایٹ لا فرنگ روڈ لاہور)

پانچ شہرہ آفاق کتابیں

جن کی شہرت کا سلسلہ چار دانگ عالم میں بج چکا ہے اور ہندوستان کی سات ٹکسٹ بک کمیٹیوں میں انعامی کتب منظور کی گئی

سیرت حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے حالات زندگی میں ملک کی مہذب مستورات اور جوان لڑکیوں کے لئے بہترین کتاب۔ کتاب کی عبارت اردو نثر کا انتہائی لطف دکھاتی ہے مزار مبارک کا نقشہ اور فوٹو ساتھ ہیں قیمت مجلد ۲؍ بلا جلد ۱۲؍

سیرت حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ

رسول اکرم صلعم کی پہلی اور محبوب ترین بیوی حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے حالات۔ یہی ایک بیوی ہیں جن سے آپکا سلسلہ اولاد چلا آپ کے مزار کا فوٹو کتاب کے ساتھ لگا ہوا ہے قیمت مجلد ۱۲؍ بلا جلد ۸؍

سیرت حضرت فاطمۃ الزہرا رضؓ

یہ کتاب پانچویں دفعہ طبع ہوئی ہے بلکہ ملک میں از حد مقبول ہوئی ہے۔ درد انگیز واقعات سے بھرا ایک شریف عورت کے پڑھنے کے قابل ہے آپکی اخلاق حسنہ۔ عبادت خدا۔ اطاعت شوہر محبت خلق ایثار کفایت شعاری وغیرہ کے ہزاروں مفید سبق مستورات سیکھ سکتی ہیں کتاب میں کئی فوٹو ہیں مجلد ۱۲؍ بلا جلد ۸؍

سیرت حضرت بلال رضؓ

یہ اس حبشی غلام کے حالات ہیں جو رسول اکرم صلعم کے اثر صحبت سے اس درجہ تک پہونچ گیا تھا جس کے حصول میں لاکھوں بندگان خدا ابتک ناکام ہیں۔ مصنف نے بدون وضو کتاب کا ایک حرف بھی نہیں لکھا آپ کے مزار کا فوٹو کتاب میں ہے مجلد ۱۲؍ بلا جلد ۸؍

سیرت حضرت امام حسین علیہ السلام

حضرت شہید کربلا امام حسین علیہ السلام کے حالات زندگی جس میں آپکے مزار اور شہیدان کربلا کے مزاروں کے فوٹو بھی دئیے گئے ہیں ولایتی کاغذ اعلیٰ درجہ کی لکھائی اور خوبصورت ولایتی جلد ہے قیمت مجلد ۱؍ بلا جلد ۱۲؍

ملنے کا پتہ:- منیجر رسالہ صوفی پنڈی بہاؤالدین ضلع گجرات (پنجاب)

شفاخانہ احمدی عثمانی و امرت فارمیسی باسودہ

جی - آئی - پی - ریلوے - قائم شدہ ۱۸۸۵ء کی امرت پلز تیر بہدف مشہور ادویہ کا ایک مرتبہ ضرور تجربہ فرمایئے -

بیکار ہیں جو جوانان نونہال + ہاں انکے واسطے ہیں یہ امرت کی گولیاں

مردانہ قوتوں کی حفاظت اور امراض کا قلع قمع کرنیوالی بے نظیر دوا ہے جسمیں کشتہ جات طلا و نقرہ ڈمیانہ فاسفورس جیسے بیش بہا مرکب شامل ہیں آپ اپنے امراض سے پریشان اور مایوس ہوں سچے طور سے تجربہ کا مشورہ دیا جاتا ہے - پرہیز ندارد ہر عمر و موسم کے لایق قیمت فی شیشی ۲۴ گولیاں تین روپیہ (سے ،)

ٹانک پلز جو احباب امرت پلز استعمال نکر سکیں وہ ٹانک پلز استعمال کریں انکے فوائد امرت پلز سے کسیطرح کم نہیں - ایکمرتبہ ضرور تجربہ کیجیے - قیمت ۴۸ گولی ۸ء

زاہدی - زچگی کے زمانہ میں بچہ و زچہ کو استعمال کرانے سے کافی حفاظت ہوتی ہے (نوٹ) خریداران نگار رہبر و الصنف قیمت پر خرید سکتے ہیں زاہدی دو شیشی سے کم روانہ نہوگی

نجات المومنین (قیمت ۴ء) مسئلہ روزہ نماز بچوں بچیوں کے یاد کرنے کے لئے بہت سادگی سے نظم کئے گئے ہیں جو معمولی سمجھ کا آدمی سمجھ سکتا ہے ہر مسلمان گھر میں رہنے کے لائق ہے مستورات بچوں کو یاد کرا سکتی ہیں -

المشتہر - پروپرائٹر حکیم سید ظہور الحسن الف - ٹی - ایس

بچیوں پر رحم کیجیے

اور ضرور ضرور انہیں **صبح زندگی - شام زندگی - شب زندگی** منگا کر پڑھوایئے یہ تینوں کتابیں عورت کی دین دنیا سنوار دیتی ہیں ہم نے اپنا وقت تو جیسا گذارنا تھا گزار ہی لیا لیکن آیندہ نسلوں کے لئے تو یہاں دوزخ بنایئے اور نہ وہاں - ہندوستان کے تمام مشہور لوگوں اور کل ممتاز اخباروں کو اتفاق ہے کہ اس بارہ میں صبح زندگی - شام زندگی - شب زندگی سے بہتر مددگار نہیں مل سکتا - صبح زندگی کی قیمت عہ ہے - شام زندگی کی قیمت عہ ، - شب زندگی کی قیمت عہ ، فی الحال کوئی ایک حصہ منگا کر ہمارے وعدہ کی سچائی دیکھیے -

المشتہر - منیجر درویش پریس - دہلی

سُدھا سِندھ

بلا انوپان کی دوا

کف - کھانسی - ہیضہ - دمہ - اسہال - سنگرہنی - پیٹ درد جی متلانا بالکوں کے ہرے پیلے دست اور درد معدہ کی ایک خوش ذائقہ اور خوشبودار دوا صرف پانی میں ملا کر دینے سے ایک خوراک اپنا اثر دکھاتی ہے قیمت فی شیشی ۸ر محصولڈاک

دورو گج کیسری یعنے داد کی دوا

بلا کسی جلن اور تکلیف کے دو تین مرتبہ لگانے سے ہی درد کو آرام کرنے کی سب سے اچھی دوا ہے قیمت فی شیشی ۴ر آنہ - ایک سے ۴ شیشی تک محصول ڈاک ۸ر

بال سُدھا

کمزور اور دبلے پتلے اور اکثر بیمار رہنے والے بچوں کو طاقتور اور موٹا تازہ بنانے والی حکمی دوا ہے قیمت فی شیشی (۱۲ر)

پورا حال جاننے کے لئے بڑی جنتری مفت منگا لو -

(سب جگہ ایجنٹوں کی ضرورت ہے)

ملنے کا پتہ

سکھ سنچارک کمپنی متھرا

حافظ امام الدین پبلشر نگار نے صرف ٹائیٹل ابو العلائی اسٹیم پریس آگرہ میں چھپوایا